تفليق

ماہنامہ تخلیق لاہور

بانی مدیر اظہر جاوید

1969-2012ء

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 43	دسمبر 2012ء	شمارہ : 12

قیمت فی پرچہ : 100روپے ..... سالانہ : 500روپے

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki,
Super Town, Lahore-Cantt.

فون نمبرز: 04236620499۔04236671007.....موبائیل فون:03218899007
ای میل:ajavedtakhleeq@yahoo.com.....ajavedtakhleeq@gmail.com

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخر سانس تک جاری رکھیں گے۔انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 رفروری 2012ء کو اپنی جان..... جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود..... میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔(انشا اللہ) جو مدیر اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔میں توقّع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔یہ اہلِ دل شاد آباد رہیں۔ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کی باقاعدہ اشاعت کے لئے ''تخلیق فاؤنڈیشن'' قائم کی جارہی ہے۔دفتر ''تخلیق'' کی تبدیلی اور پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ اور ہندوستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ **نیّر جہاں، تاشی ظہیر اور نارنگ ساقی** صاحب نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔یورپ اور امریکہ کے لئے زرِتعاون پچھتر (75) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لئے زرِسالانہ صرف 1,000 روپے ہے۔

تخلیق کا نیا پتہ: **E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt**

PAKISTAN
Soonan Azhar
E/13/13C-1, Bismilla Lane, Cavalary Ground, Officer Colony, St.No.7 Walton Lahore-Cantt.
Ph: 04236671007
Cell : 0321-8899007
Email:ajavedtakhleeq@gmail.com
:ajavedtakhleeq@yahoo.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New Delhi-110001, India
Ph: 0091-9811580888
Email:narangsaqi@gmail.com

U.S.A.
Naiyar Jahan
721-Hill Street
111-Santa Monica
C.A. 90405, U.S.A.
Ph : 0013103969303
Email:Zihanat@hotmail.com
urdu@urdu markaz.com

U.S.A.
Tashie Zaheer
591-Sylvanave
Mountain View
C.A.94041
U.S.A.
Ph: 0015107503297
Email: tzaheer@gmail.com

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

مضامین

نواب مصطفےٰ خان شیفتہ — ڈاکٹر انور سدید — 7
پل دو پل کا شاعر — سکندر حیات میکن — 10

نظمیں

قیمت بلند کر..... — ڈاکٹر شباب للت — 14
پھر یوں ہوا — ڈاکٹر وزیر آغا — 14
ہدایت کار — شہزاد نیّر — 15
نظمیں — علیم صبا نویدی — 15
قطعات — کرشن پرویز — 16
رہنماء — سیفی سرونجی — 17
میں ابھی نرسری میں پڑھتا ہوں — غلام الثقلین نقوی — 17
پرواز — صفدر صدیق رضی — 18
خواہشوں کا سفر — نیر رانی شفق — 18
گیت — عمر برناوی — 19
گیت — نوید قتیل — 19

افسانے

گورے کالے — عزیز میرٹھی — 20
انشورنس — ثمینہ سیّد — 25
ایک دہشت گرد کا بیان — مراق مرزا — 30
بڑی مشکل ہے پنگھٹ کی ڈگر — زہیرہ سمن علی — 34
جذبۂ عشق — نجیب عمر — 36
پانی پر لکھی نصیحت — دردانہ نوشین خان — 42

غزلیں

کشمیری لال ذاکر، حسن عسکری کاظمی، شاہین، اعزاز احمد آذر، سعید احمد اختر، کرامت بخاری، بیدار سرمدی، رفیع الدین ذکی، شباب للت، سلیمان خمار، کرشن کمار طور پرتپال سنگھ بیتاب، ڈاکٹر محبوب راہی، خان پرویز، شفیق احمد فاروقی، باقر رضا، میثم علی آغا، عبدالجبار اثر، ندیم ہاشمی، شہزاد نیّر، امتیاز کاظمی، عظیم راہی، روبی جعفری — 46–57

ڈائری

سنگریزے اور جواہر — غلام الثقلین نقوی — 58

انشائیہ

تھکن — سلیم آغا قزلباش — 62

آپ بیتی

میری کہانی — فرخندہ لودھی — 65
نکلے ہوئے جنت سے — عزیز میرٹھی — 68

سفرِ شمال	طارق محمود	74
بیتے کل کا اِک اِک پل	نذر فتح پوری	79

یادنگاری

کرنل مجید ملک	شفیع عقیل	84

جائزے

روس کی ایک جھلک	پروفیسر جمیل آذر	91

گوشۂ اظہر جاوید

''تخلیق'' کے ایڈیٹر اظہر جاوید کے نام	اسلم گورداسپوری	95
خلوص وانکسار کا پیکر۔اظہر جاوید	دیپک بدکی	99
اظہر جاوید کی یاد میں	اکرام تبسم	103
تمام عمر بسر کی تو......	تسنیم کوثر	105
منظوم نذرانے	منور سلطانہ بٹ حسین شاہد (ہالینڈ)	107
سوالنامے کی روشنی میں	سیما پیروز منور سلطانہ بٹ	108
اظہر جاوید کی نظمیں اور غزلیں		112
اظہر جاوید کے خطوط		114

پنجاب رنگ

نظم	سلیم شہزاد	119
کافی	محمد جنید اکرم	119
کافی	حسن اعزاز	120
چھڈ اُڑیا	منزہ شاہد	120

تبصرے

ڈاکٹر انور سدید۔آفتاب خان		121

انجمن خیال

سلیم آغا قزلباش، افتخار مجاز، علی سفیان آفاقی، انور سدید، شاہد علی خاں، آفتاب راجا، نجیب عمر، آصف ثاقب، بسمل صابری، غلام نبی اعوان، تسنیم کوثر، عظیم راہی، سیفی سرونجی، سید علی جمال نقوی، کرامت بخاری، جمیلہ شبنم، زوار حسین، اعزاز احمد آذر، شاہین، ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر جلیل الرحمٰن، سیدار شاد وارث، راشد کندی، ممتاز احمد خان، روپا صبا، دردانہ نوشین خان، ڈاکٹر وصی عمرانی واجدی، مہ جبین قیصر، جنید امجد، خالد حسین عبداللہ، کرشن پرویز، شہزاد نیر، سکندر حیات میکن، مسرت رعنا، محمود رحیم، تسنیم فاطمہ 128–144

سرورق
انیس یعقوب

ناشر
سونان اظہر جاوید 0321-8899007

قانونی مشاورت
سیّد محمد شاہد بخاری

طابع
بیدار سرمدی

مطبع
بُکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقام اشاعت
E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

پہلی بات

''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' اور اس کے بعد دو عام شمارے پیش کر کے میں نے اہلِ ادب کو باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ 43 سال تک مطلعِ ادب کو روشن رکھنے والا رسالہ اپنے مدیر اظہر جاوید کی موت کے بعد بھی عدم اشاعت کا شکار نہیں ہوا بلکہ ''تخلیق'' نے اپنا ادبی سفر وہیں سے شروع کیا ہے جہاں اظہر جاوید صاحب نے چھوڑا تھا۔ ''انجمن خیال'' میں اہلِ ادب نے میری اس معمولی مساعی کو سراہا ہے اور یہ بات کہتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ اب ''تخلیق'' کا نیا دور شروع نہیں ہوا بلکہ یہ سابقہ دور کا ہی تسلسل ہے اور اس کی ترتیب و تدوین میں اظہر جاوید کے سب دوست اور روحانی طور پر خود اظہر جاوید بھی شامل ہیں۔

بہت سے کرم فرماؤں نے اس حقیقت پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ مالی خسارے کے اس اشاعتی سلسلے کو اظہر جاوید نے 43 برس تک کس طرح جاری رکھا۔ وہ جب کبھی اپنے دوستوں کا فخر سے ذکر کرتے اور بتاتے کہ وہ سماجی لحاظ سے کتنے بلند مراتب پر فائز ہیں تو میں سوال کرتا ''ابّو! آپ اپنے تعلّقات کو کام میں کیوں نہیں لاتے؟ اپنی ذات کے لئے نہ سہی ''تخلیق'' کے لئے ہی ان کا عملی تعاون حاصل کیجئے۔'' مسکرا کر کہتے ''تم بڑے ہو کر اس حقیقت کو سمجھو گے کہ دوستی کو وفاداری بشرطِ استواری قائم رکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ دور و یہ ٹریفک نہیں۔ جس دن میں نے کسی دوست کو ''تخلیق'' کے لئے آزمائش میں ڈالا اسی روز دوستی کا ناتہ خطرے میں پڑ جائے گا اور دُکھ میری ذات کو ہی ہوگا۔'' اب ''تخلیق'' کی اشاعت کے عملی تجربے سے گزر رہا ہوں تو حقیقت کھل رہی ہے اور چہروں کا نقاب اُتر رہا ہے۔ تاہم میں اپنے ان معاونین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس حقیقت کو پا لیا کہ کتاب کے زوال اور میڈیا کے فروغ کے دور میں اب تخلیق کار ہی ادبی رسالے کے قاری بھی ہیں اور انھیں اس کی اشاعت میں معاونت کرنی چاہیے۔ وجہ یہ کہ اگر رسالہ باقاعدگی سے شائع ہی نہ ہوا تو نامور اور ممتاز لکھنے والوں کی تخلیقات اور ادب میں کئے جانے والے تجربات سے باہم شناسائی کس طرح ہوگی۔ ادب کے نئے رجحانات کو تحریک کس طرح بنایا جائے گا اور پاکستانی تہذیب و تمدن اور افکار و نظریات کی شمع کس طرح روشن رکھی جائے گی؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب بیشتر کتابیں مصنفّین کے اپنے خرچ پر چھپ رہی ہیں اور اس میں ناشر کا گراں قدر منافع بھی شامل ہوتا ہے جس سے مصنّف کو بے خبر رکھا جاتا ہے۔ شکایات یہ بھی ہیں کہ بعض ناشرین مصنّف کو ان کی کتاب کی طباعت کی زیادہ تعداد بتا کر چھاپتے کم ہیں۔ ایک صاحب تو یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ناشر اتنی تعداد میں کتاب چھاپتا ہے جتنے نسخے مصنف کو پیش کر دیتا ہے۔ اشاعت ادب کی اس بدترین صورت کی جتنی مذّمت کی جائے کم ہے کیوں کہ اسی سے مصنف کو ادبی لحاظ سے گمنامی کی موت سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ادبی رسالہ معیّنہ وقت پر چھپتا ہے، پوری اردو دنیا میں تقسیم ہوتا ہے اور اگلے ماہ پڑھنے والوں کا ردِعمل خطوط میں چھپتا ہے تو لکھنے والوں کو اس سے مزید معیاری ادب تخلیق کرنے کی تحریک ملتی ہے اور یہ دعویٰ

کیا جاسکتا ہے کہ ادب کے فروغ میں باقاعدہ چھپنے والے رسائل دوسرے ذرائع ابلاغ کے مقابلے میں زیادہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کتاب چھاپنا کاروبار ہے، رسالہ چھاپنا ادبی خدمت بلکہ ادبی عبادت ہے۔ اس عبادت میں ہی آپ کو بھی شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔

آپ تک یہ خبر پہنچانا بہت ضروری ہے کہ گزشتہ دنوں لاہور کے چند نامور ادیبوں نے اس موضوع پر ایک محفل مذاکرہ منعقد کی۔ اہتمام ادارہ ''تخلیق'' نے کیا۔ اس میں **محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محترم ڈاکٹر انور سدید، محترم جاوید منظور صاحب، محترم پیروز بخت قاضی صاحب، محترم طاہر منظور صاحب، محترمہ بشریٰ اعجاز صاحبہ، محترمہ سیما پیروز صاحبہ، محترمہ ڈاکٹر غزالہ نثار صاحبہ، محترمہ ڈاکٹر صغریٰ صدف صاحبہ، محترمہ تسنیم منٹو صاحبہ، محترمہ لبنیٰ جاوید صاحبہ اور محترمہ عمرانہ مشتاق صاحبہ** نے ادبی رسائل کی مشکلات کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی اور پختہ ارادہ ظاہر کیا کہ اس محفل میں شامل اربابِ ادب ''تخلیق'' کو زندہ رکھنے میں میری معاونت کریں گے اور اس تعاون کے لئے مزید لکھنے والوں کو راغب کریں گے۔ اس محفل میں ''تخلیق'' کو ماہنامہ بنانے کی تجویز بھی سامنے آئی تاہم میری معمولی کاوش کو بھی سراہا گیا کہ اظہر جاوید کی وفات کے بعد ایک ضخیم اور دو معمول کے شمارے شائع کیے۔ کچھ دوستوں نے سہ ماہی اشاعت باقاعدگی سے پیش کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ جبکہ حسبِ سابق دو ماہی اشاعت قائم رکھنے پر ہی اصرار کیا گیا۔ یہ قیمتی تجاویز میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ''انجمنِ خیال'' میں اظہارِ رائے کیجیے۔

وفیات

گذشتہ دنوں اردو کی ایک ممتاز افسانہ نگار محترمہ ہاجرہ مسرور کراچی میں انتقال کر گئیں۔ ہاجرہ مسرور 1929ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھیں۔ آزادی کے بعد لاہور آئیں۔ شادی کے بعد کراچی منتقل ہوئیں۔ ''چرکے''، ''چاند کے اُس طرف''، ''ہائے اللہ''، ''چوری چھپے''، ''تیری منزل''، ''وہ لوگ'' اور ''اندھیرے اُجالے'' ان کے افسانوں کے مشہور مجموعے ہیں۔ اس ادبی سانحے پر ادارہ ''تخلیق'' افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ پرچہ مکمّل ہو چکا تھا کہ اسلام آباد سے نظمِ جدید کی تازہ فکر شاعرہ ثمینہ راجہ کی وفات کی خبر آ گئی۔ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا تھیں لیکن ڈاکٹروں کو خبر اس وقت ہوئی جب مرض خطرناک حد میں داخل ہو چکا تھا۔ ثمینہ راجہ کے متعدد شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ انہوں نے رسالہ ''کتاب'' اور ''آثار'' کی ادارت کے فرائض بھی ادا کیے۔ پاکستان بُک فاؤنڈیشن میں خدمات انجام دیں۔ ممتاز شاعر احمد فراز ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ فیصل نجمی صاحب ان کی ادارت میں ''آثار'' کی تجدیدِ اشاعت کرنے والے تھے کہ کوہِ ندا سے ثمینہ راجہ کو بلاوا آ گیا۔ ممتاز ڈرامہ نگار اصغر بٹ اور رسالہ 'اوراق' کے مدیر معاون اور نقاد سجاد نقوی نومبر 2012ء میں اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ حق تعالیٰ اُن سب کی مغفرت کرے۔

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

نواب مصطفٰے خان شیفتہ

ڈاکٹر انور سدید

انیسویں صدی کے وسط میں دارالحکومت دہلی کو جن ادبی شخصیات نے مرقعِ نور بنا رکھا تھا ان میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، آزردہؔ، صہبائیؔ اور شیفتہؔ جیسے شعرا شامل تھے، ان نابغوں میں شرافت اور وضع داری، تہذیبی قدروں میں ایمان و ایقان اور عمل، انسانوں سے خلوص مندانہ رویّہ اور علم و ادب کا اعلیٰ ذوق قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیفتہ کا نام محمد مصطفٰے خان تھا۔ ان کے والد مرتضٰی خان کو گوڑ گاؤں کے مضافات میں لارڈ لیک کے دور میں کچھ علاقہ جاگیر کے طور پر ملا تھا لیکن یہ جاگیر ان کی وفات کے بعد واپس ہوگئی اور انگریزوں نے 20 ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی تاہم 1814ء میں جہانگیر آباد کا علاقہ مرتضٰی خان نے خرید کر اپنے بیٹے مصطفٰے خان کے نام کر دیا تھا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں شیفتہ نے باغیوں کا ساتھ دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پنشن تو موقوف ہوگئی لیکن جہانگیر آباد کا زرخرید علاقہ شیفتہؔ کی ملکیت میں رہا۔

نواب مصطفٰے خان شیفتہ دہلی میں 1809ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت حکومت تو مغلوں کی تھی لیکن مرہٹوں نے دہلی میں قتل اور غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فوج سے امن قائم اور شہر کی تہذیبی اور علمی و ادبی فضا بحال کی تھی۔ اس نسبتاً پرامن ماحول میں محمد مصطفٰے خان نے عربی اور فارسی زبانوں پر دسترس حاصل کی، شعر و سخن کی علمی اور تہذیبی زبان اردو پر عبور حاصل کیا۔ علمائے دہلی سے حدیث و تفسیر اور قرأت کا درس لیا۔ شاعری دہلی کی فضا میں خوشبو کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ مصطفٰے خان کی فطرت نے بھی اس خوشبو کو قبول کیا۔ شاعری کرنے لگے، تو حکیم مومن خان مومن کی شاگردی اختیار کی اور سخن فہمی میں غیر معمولی صلاحیت پیدا کی، اردو میں شیفتہؔ اور فارسی میں حسرتیؔ تخلص اختیار کیا اور پُرخلوص دوستی اسداللہ خان غالب سے پیدا کی۔ غالبؔ قمار بازی کے جرم میں قید ہوئے تو شیفتہؔ ان سے ملاقات اور دیکھ بھال کے لیے باقاعدگی سے جیل خانے جایا کرتے تھے۔ مرزا نے ان کے نام خطوط لکھے اور دوسرے دوستوں کے خطوط میں ان کا ذکر کرتے تھے۔ بغاوت کے الزام میں شیفتہ پر مقدمہ چلا تو غالبؔ نے حکیم غلام خان نجف کو لکھا:

> ''مصطفٰے خان کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبسِ ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں؟'' (مکتوب اپریل 1858ء)

دہلی کے دولت مند شریف زادوں کی طرح شیفتہؔ نے، بھی ایک شاہد بازاری جس کا نام ''رم جو'' تھا ٹوٹ کر عشق کیا اور نشاطِ وصال

اور اذیّتِ فراق کا حال شیفتہ کی مثنویوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دو اشعار جن میں ''رمجو'' کا نام بھی آیا ہے اور شیفتہ کی بے قراری بھی عیاں ہوتی ہے حسبِ ذیل ہیں:

عاشق سے یہ رَم جو کر گئے تم — ہاں اپنے ہی نام پر گئے تم
اب تازہ رقیب شاد ہوں گے — ہم کاہے کو تم کو یاد ہوں گے

فرقت کا شدید اضطراب غزل کے اشعار میں بھی در آیا ہے۔

ہم سے اسے معاملہ تھا جان و جنم کا — ہرگز ملا نہ گاہ ..... ہوا ہائے جب سے دور
کیوں کر کہیں کہ چھوٹ گئے ہم بندِ جسم سے — اس زُلفِ پیچ پیچ میں الجھی ہے جاں ہنوز

1839ء میں شیفتہ اپنی والدہ اور نانی کے ساتھ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے حجازِ مقدس گئے اور فروری 1841ء میں واپس آئے تو بدلے ہوئے انسان تھے۔ اور اپنی والدہ اور نانی سے محروم ہو چکے تھے جن کا انتقال مکہ معظّمہ میں ہو گیا تھا۔ اس مقدس سفر کی یادگار ان کا سفرنامۂ حج ''رہ آورد'' ہے جس کا اردو ترجمہ سیّد زین العابدین نے ''سراجِ منیر'' کے نام سے کیا تھا۔

شیفتہ بزرگانِ دین سے عقیدت رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے شاہ محمد اسحاق محدّث دہلوی سے بیعت کر رکھی تھی۔ اور شاہ غلام علی نقش بندی اور شاہ عبدالغنی مجددی سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔ ارضِ حجاز سے واپس آئے تو زیادہ وقت عبادت میں گزارتے لیکن شعر و شاعری سے تعلق قائم رکھا اور شعرائے دہلی کو اپنے گھر پر مدعو کرتے اور شاعری کی محفلیں برپا کرتے۔ ان کا گھر دہلی میں علم و ادب کا مرکز تھا اور ان کی سخن فہمی کی سب لوگ تحسین کرتے تھے۔

1857ء کی بغاوت میں مصطفٰے خان شیفتہ باغیوں کے ساتھ تھے۔ ان کے قلعہ جہاں گیر آباد کو لوٹ لیا گیا۔ کتب خانے کو آگ لگا دی گئی۔ بغاوت کے مقدمے میں شیفتہ کو سات سال کی قید اور جائیداد کی ضبطی و پنشن کی موقوفی کا حکم سنایا گیا۔ نو، دس مہینے قید کاٹنے کے بعد نواب صدیق حسن خان کی کوشش اور سفارش سے جنوری 1859ء میں رہا ہوئے تو دہلی میں سکونت اختیار کرنے کی بجائے جہانگیر آباد اور میرٹھ میں بود و باش اختیار کی۔ شیفتہ کی زندگی کا یہ دور صعوبتوں اور پریشانیوں میں گزرا۔ ذیابیطس کے ساتھ سرطان کے مرض نے بھی حملہ کر دیا اور صحت روز بروز گرتی چلی گئی۔ 15 فروری 1869ء کو غالبؔ کی وفات ان کے لیے جانکاہ صدمہ ثابت ہوئی اور نواب مصطفٰے خان شیفتہ 29 ستمبر 1869ء کو وفات پا گئے۔ مولانا حالی نے ان کی تاریخ وفات قرآنِ مجید کی اس آیت سے نکالی: ''وجزاھم بما صبروا جنات وحریرا'' (1286ھ)

انہیں سلطان المشائخ محبوب الٰہی کی درگاہ میں اپنے جدِّ امجد کے قریب دفن کیا گیا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنی 'تاریخ ادبِ اردو' میں لکھا ہے کہ:

''نقاد انفرادی حیثیت سے شیفتہ کا نام لینے سے اکثر و بیشتر گریز کرتے ہیں، جہاں کہیں غالب اور مومن کا حوالہ ہو گا وہاں شیفتہ کو بھی یاد کر لیا جائے گا۔ اکثر نقاد اس کو تلامذۂ مومن کے زمرے میں لا کر محدود کر دیتے

ہیں۔''(ص791)۔

میں نے''اردو ادب کی مختصر تاریخ لکھی تو شیفتہ کی شاعری کو لطیف نفسیاتی کیفیات کا مرقع قرار دیا اور لکھا کہ وہ عشق کو حواسِ خمسہ سے الگ نہیں کرتے اور اپنے استاد مومن کی طرح لذتیت پیدا کرتے اور شگفتنِ معنی پر زیادہ زور دیتے ہیں، چنانچہ معنی کی تصمیم سے تجربے کا جوہر آشکار ہوتا ہے اور شعر ضرب المثل کی طرح مشہور ہو جاتا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں :

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

اتنی نہ بڑھا پاکئ داماں کی حکایت — دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

نہ دیا ہائے مجھے لذّت آزار نے چین — دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو، آئے، کرے شکار مجھے

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام — بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا

زیاں ہے عشق میں ہم خود بھی جانتے ہیں مگر — معاملہ ہی کیا ہو، اگر زیاں کے لیے

شیفتہ کی شاعری میں سیّد احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد سے ذہنی وابستگی کے اشارے بھی ملتے ہیں لیکن ان کا انداز ایمائی ہے:

ہر خار و خس میں وجہ ہے ہر سنگ و خشت مست — کیا مے کشوں نے آ کے کیا خانقاہ میں

جان کھونی ہے جسے مدِّنظر، مثلِ حباب — وہی مشتاقِ فنا چشم کو تر کرتا ہے

دل دیں گے، مال دیں گے، مگر جاں سو بخیر — بے ہودہ ہے وہ شخص جو سرگرم لاف ہو

بھارت کے ادبی مؤرخ رام بابو سکسینہ، احتشام حسین، علی جواد زیدی، ڈاکٹر اعجاز حسین، عبدالقادر سروری کے برعکس پاکستانی نقادوں مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر وزیر آغا، مولانا صلاح الدین احمد، کلب علی خان فائق اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے شیفتہ کے فن کی تحسین و تشریح کشادہ نظری سے کی ہے اور کلیّاتِ شیفتہ 1965ء میں کلب علی خان نے مرتب کر کے لاہور سے شائع کیا۔ علی صفدر جعفری نے شیفتہ کی زندگی اور فن پر 1989ء میں پی ایچ ڈی کا پہلا تحقیقی مقالہ بھی پاکستان میں لکھا۔ اردو شعرا کے''تذکرہ گلشنِ بے خار'' نے شیفتہ کو انیسویں صدی میں شہرت سے سرفراز کیا۔ اس تذکرے کا متن فارسی میں اور اشعار کا انتخاب اردو میں ہے۔ اور اسے شیفتہ کی شعر فہمی اور تنقیدی ذوق کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے خیال ظاہر کیا کہ شیفتہ نے صرف اپنے حلقۂ احباب کے شعرا سے انصاف کیا ہے اور کہیں کہیں ذاتی تعصب کے آثار بھی ملتے ہیں۔ اس کے باوجود اس تذکرے کی تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ شیفتہ کا فارسی دیوان بھی چھپ چکا ہے جس میں انہوں نے اپنا تخلص''حسرتی'' سے موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی رائے میں:

''شیفتہ نے اپنے دیوان کو نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال قرار دیا ہے.....تو کچھ بے جا نہیں۔''

◆◆◆

پل دو پل کا شاعر

سکندر حیات میکن

ساحر لدھیانوی اُردو نظم اور غزل میں ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ ساحر کی شہرت ان کی نظم نگاری اور گیت نگاری کی بدولت ہے لیکن صنفِ غزل میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ ان کی غزلیں تغزل سے بھرپور ہیں بلکہ بعض نظموں میں بھی تغزل کی شان پائی جاتی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم ساحر کی غزل گوئی کا جائزہ لینے کی کاوش کریں گے۔

ساحر لدھیانوی کے کلیات میں غزلیں تعداد کے لحاظ سے کم ہیں۔ ان کی شاعری کے پہلے مجموعہ ''تلخیاں'' میں صرف نو غزلیں ہیں جبکہ دوسرے مجموعے ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' میں تیرہ غزلیں ہیں لیکن بعض غزلوں پر کوئی ایک مصرعہ لکھ کر ان کو بھی شاملِ کلیات کیا گیا ہے اور بعض پروف پر اشعار کا عنوان لکھ دیا گیا ہے اس طرح کم و بیش ان کی غزلوں کی کل تعداد 62 بنتی ہے۔ مقدار کے لحاظ سے کم سہی مگر معیار کے حوالے سے ساحر نے غزل کے سانچے میں اپنی آواز کو کم نہیں ہونے دیا بلکہ روایتی سانچوں سے ہٹ کر ایک نیا رنگ و آہنگ اور لب و لہجے سے بھرپور انداز روشناس کروایا ہے اور ساحر کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی غزل گوئی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ساحر محبتوں کا زہر پی کر جوان ہوا۔ کبھی حسین خواب تو کبھی کڑوی تعبیریں، ان کی زندگی میں دھیرے دھیرے چلتی رہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے

انہیں اپنا نہیں سکتا، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

ساحر لدھیانوی کی غزل میں عشق و محبت کے لطیف جذبات کے رنگ بہت گہرے اور شوخ ہیں۔ ان کی غزل میں قلبی واردات اور زندگی میں ملنے والی مایوسیوں اور ارمانوں کی ایک کہکشاں ہے جس کا طلسم قاری کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ محبتوں کے سفر میں ملنے والے دُکھوں اور حادثوں کا نوحہ بھی ساحر نے بڑے اچھے انداز میں رقم کیا ہے۔ ساحر کبھی محبوب کی یاد کے دُھندلے خرابوں میں گم ہو جاتا ہے تو کبھی گیسوئے یار میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔

تجھ کو خبر نہیں، مگر اک سادہ لوح کو　　برباد کر دیا تیرے دو دن کے پیار نے

.....

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے　　ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
مایوسیوں نے چھین لیئے دل کے ولولے　　وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے

.....

نیلام ہو رہا تھا کسی نازنیں کا پیار　　قیمت نہ چکائی گئی اک غریب سے

.....

تغزل کے نقوش بھی ساحرؔ کی غزل میں واضح ہیں جو ساحر کی غزل کو صحیح معنوں میں غزل بناتے ہیں۔ساحر نے بڑے عام اور سادہ سے رنگ میں زندگی کی کشمکش کے موضوعات کو پیش کیا ہے اور اظہار کے خوبصورت پیرائے کو اپنایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ساحر کا اسلوب ہی ساحر کی خاص پہچان بن گیا ہے۔صاف اور نتھرا ہوا اسلوب جس میں خوبصورت الفاظ اور نادر تراکیب کا ایک ایسا سنگم ہے جس میں محبتوں کے گیتوں کی مہکار بھی ہے اور جوغم کا پاسدار بھی ہے۔ساحرؔ کا اپنا ایک خاص ڈکشن اور خاص انداز ہے، جو صرف اور صرف ان کا اپنا ہے، جو عام فہم بھی ہے اور اپنے اندر معنوی گہرائی اور گیرائی بھی رکھتا ہے۔مثلاً :

لو! آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید　　لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم
گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے　　پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

.....

یہ منظر کون سا منظر ہے، پہچانا نہیں جاتا　　سیہہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری

.....

ساحرؔ نوجوان دلوں کی دھڑکنوں کا شاعر ہے۔ساحرؔ کے جواں جذبے اور تڑپ کی شدّت ہر محبت بھرے دل کو تڑپا دیتی ہے۔ ساحرؔ کا پیغام محبت ہے۔وہ محبتوں کا شاعر ہے اور محبتوں کی خلش کو برداشت کرنے کی ہمّت اس کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے۔دُکھوں سے لڑنا اور سماجی کشمکش کے تھپیڑوں کو سہنا ساحرؔ کی غزل کا حصہ ہے۔طبقاتی ناہمواری اور سماجی مظالم کے خلاف بھی ساحرؔ کی غزل میں ایک کھچاؤ موجود ہے لیکن وہ امن کا پیامبر ہے اور آشتی کا پیغام اور رجائیت کا پیام اس کی پوری شاعری میں بھی واضح ہے۔فارغ بخاری کے بقول :

> ''ساحرؔ بڑا دکھی انسان تھا لیکن ترقی پسند آئیڈیالوجی نے اسے غمِ ذات کو غمِ کائنات میں مدغم کرنے کا شعور دیا۔وہ ساری زندگی اپنے اندر اور باہر کے دشمنوں سے نہایت حوصلہ سے نبرد آزما رہا۔وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا لیکن آخر تک ہار نہیں مانی۔وہ ہمیشہ اپنے غموں، اپنے دُکھوں کو قہقہوں میں اُڑاتا رہا۔''

ساحرؔ لدھیانوی نے اپنی غزل میں بھی بربادیوں کا سوگ نہیں بلکہ ان کا جشن منایا ہے' وہ خوشی اور غم کو دل سے قبول کرتا ہے اور یہی ساحرؔ کا آدرش ہے۔ مثلاً :

آپ دولت کے ترازو میں دلوں کو تولیں — ہم محبت سے محبت کا صلہ دیتے ہیں
تخت کیا چیز ہے اور لعل و جواہر کیا ہیں — عشق والے تو خدائی بھی لُٹا دیتے ہیں

.....

مجھے دیوتا بنا کر تری چاہتوں نے پوجا — مرا پیار کہہ رہا ہے کہ تجھے خدا بنا دوں

.....

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا — مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

.....

عشق و محبت کے لطیف جذبات غزل کا مرکز و محور ہیں جبکہ دیگر موضوعات کی بدولت بھی غزل کی اہمیّت دوچند ہو چکی ہے۔ ساحرؔ نے اپنے کلام میں عشق و محبت کے میٹھے میٹھے جذبات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور کو بھی اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے بلکہ بسا اوقات تو عشق و سیاست کو یکجا کر کے بھی پیش کیا ہے۔ زندگی کی چبھتی حقیقتوں اور مسائل پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اسی طرح جب انسان کی آرزوؤں کے نشیمن اُجڑتے ہیں اور حسرتیں دم توڑتی ہیں تو پھر زندگی کس طرح اجیرن ہو جاتی ہے' یہ سارے کرب ساحرؔ کی غزل میں ملتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے بھی ہجرت کے موضوع اور بدلتے ہوئے جغرافیے کو اور پھر بدلتی ہوئی خواہشات اور فسادات کی جنگ میں ہونے والے ارمانوں کے خون کو بھی اپنے ساحری انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

طرب زاروں پہ کیا بیتی' صنم خانوں پہ کیا گزری — دلِ زندہ! ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری
زمیں نے خون اُگلا آسماں نے آگ برسائی — جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

.....

اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے — آج تک سلگتے ہیں زخم رہگزاروں کے
پہلے ہنس کے ملتے ہیں پھر نظر چُراتے ہیں — آشنا صفت ہیں لوگ اجنبی دیاروں کے

.....

تشبیہات و استعارات سے بھی ساحرؔ نے اُردو غزل کی مانگ کو سجانے کی خوبصورت سعی کی ہے مگر ایسے اشعار کی تعداد کم ہے۔ ساحرؔ نے اس جھوٹے سنسار کا فسانہ اپنی نظموں کی طرح غزلوں میں بھی گایا ہے اور محبتوں کے دیپ جلا کر وفاؤں کی بستیوں کو آباد کیا ہے۔ فکری و فنّی حوالے سے دیکھا جائے تو ساحرؔ کی غزل میں فکری اُپج اور فنی بالیدگی نمایاں ہے۔ خیال کی سادگی اور

عام فہم بحروں نے ساحرؔ کی غزل کو رنگین اور دلکش بنا دیا ہے مثلاً :

عرصۂ ہستی میں اب تیشہ زنوں کا دور ہے　　رسمِ چنگیزی اُٹھی، توقیرِ دارائی گئی

.....

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا　　بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا
کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست؟　　سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

.....

گیسوؤں کی چھاؤں میں دل نواز چہرے ہیں　　یا حسیں دُھندلکوں میں پُھول ہیں بہاروں کے

حسرتوں، محرومیوں اور ناکامیوں کا زہر پی کر جوان ہونے والا ساحرؔ اپنے سسکتے ہوئے ارمانوں اور ساگر سے ملتی لہروں، گھنیری زُلفوں، بہتی ندیوں، گاتی کوئلوں، زمانے کی تلخیوں، خوابوں کی پرچھائیوں، انجانی راہوں، حُسن کی رعنائیوں، حوا کی بیٹیوں، اونچی فصیلوں، رنگین وادیوں، گونجتے قہقہوں، بھوکی نگاہوں، ساحر آنکھوں، حسین گیتوں، حُسن کی پرچھائیوں، بہاروں کی تمناؤں، پھول کی پتیوں، چرنوں کی صداؤں، پچھّم کی ہواؤں، لرزتی نگاہوں، شبنم آلود پگڈنڈی، بیتی رُتوں، ڈھلتے موسموں، بہتے جھرنوں، خوابیدہ جزیروں، ڈھلکتے آنچلوں اور آسودہ فضاؤں کی بدولت اُردو شاعری میں ایک لیجنڈ کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔

اظہر جاوید کے بقول :

> ''ساحر کی زندگی مدّاحوں کی محبت اور عقیدت اور حاسدوں اور منافقوں کے بغض اور حسد سے بھری ہوئی تھی..... میں پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اقبال اور فیض کے بعد جس شاعر کو اس کی زندگی ہی میں بے پناہ شہرت اور مقبولیت ملی وہ کسی اور کو بیسویں اور اکیسویں صدی میں نصیب نہیں ہوئی۔''

''پَل دو پَل'' کا یہ شاعر اپنی کہانی اس انداز میں رقم کر گیا ہے کہ اُس کی آپ بیتی جگ بیتی بن چکی ہے اور یہ پَل دو پَل صدیوں پر بھاری ہیں۔ ساحر لدھیانوی اُردو شاعری کا اور جواں دلوں کا آج بھی گنگنانے والا ایسا نغمہ ہے جسے آنے والی نسلیں بھی گاتی رہیں گی۔ ساحرؔ کے خوبصورت ہونٹوں سے نکلے ہوئے خوبصورت شعر ''پل دو پل'' کا قصہ نہیں ہیں۔ ساحرؔ کی غزلیں کل بھی جوان تھیں اور ہمیشہ جوان رہیں گی۔

میں پل دو پل کا شاعر ہوں پل دو پل مری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے پل دو پل مری جوانی ہے

◆◆◆

ڈاکٹر شبابؔ للت (انڈیا)

قیمت بلند کر یارب

میرے نصیب کو یوں ارجمند کر یارب!
تُو بے بسوں کا مجھے درد مند کر یارب!
وہ گِر چُکا ہے کچھ اُس کو بلند کر یارب
مرے حریف کی روزی دوچند کر یارب!
مَیں لے سکوں بھی تو دشمن سے انتقام نہ لوں
تُو بازوؤں کو مرے بے گزند کر یارب!
ہوس شعار ہیں آنکھیں تو سیر نظری دے
ہمارے دل کو قناعت پسند کر یارب
مَیں بک نہ جاؤں کہیں مصلحت کی منڈی میں
کچھ اَور بھی مری قیمت بلند کر یارب!
مِرا خلوص، مرا عجز، میرے صبر و یقیں
کوئی تو بات مِری تُو پسند کر یارب!
بہت طویل ہے مت کھول میری فردِ گناہ
اسے تو پردۂ بخشش میں بند کر یارب!
لہو کی ہولیاں کب تک یہ کُرسیوں کیلئے؟
یہ قتلِ عام کے بازار بند کر یارب!
ہمارے اہلِ سیاست کو پاک نیّت دے
ضمیر راہبروں کے بلند کر یارب
مری حیات اگر اِک کھلی کتاب نہیں
عدم کے تُو اسے جُزداں میں بند کر یارب!
گناہ گار سہی پھر بھی تیرا بندہ ہے
شبابؔ پر نہ درِ فیض بند کر یارب!

OOO

ڈاکٹر وزیر آغا

پھر یُوں ہوا

پھر یوں ہَوا کہ ڈھونڈنے نکلی ہوا اسے
بولی : میں اس کو لے کے پلٹ آؤں گی ابھی
آخر کہاں وہ جائے گا مجھ سے چھڑا کے ہاتھ
لیکن وہ اک چھلاوہ تھا، اس کو پکڑتا کون؟
اس کا بدن تھا، دھند کی خوشبو کا پیرہن
دھندلے تھے سارے نقش، دھواں اس کی سانس تھی

O

آگے بڑھی ہوا تو وہ خوشبو کا پیرہن
اس تیز رو کے خستہ بدن سے لپٹ گیا
اور یوں وہ اس کے ساتھ خود اپنی تلاش میں
اُڑتا پھرا یقین سے حدِّ گماں تلک
پاگل ہوا کو اس کا پتا تک نہ مل سکا

OOO

شہزاد نیّر

ہدایت کار

نہیں..... یہ زاویہ اچھا نہیں
آؤ..... اِدھر سے روشنی ڈالو
وہی منظر اُجاگر ہو جو میں نے سوچ رکھا ہے
اٹھاؤ کیمرہ..... آگے بڑھو..... دیکھو!
فقط اتنا دکھاؤ جس قدر میں چاہتا ہوں
کیا.....؟
ارے لکھا ہُوا ایسے نہیں پڑھتے
اداکاری تو ایسی ہو
کوئی بھی دیکھنے والا نہ یہ سمجھے
کہ جو کرتے ہو وہ پہلے سے لکھا جا چکا ہے
دیکھ لو، جینے کی نوٹنکی تو مرنے سے بھی مشکل ہے!
ذرا مر کر دکھاؤ..... کٹ!
یہ مرنا ہے؟
ارے اس میں ذرا سی جان تو ڈالو!
وہ پچھلا بھول جاؤ سب
وہی دیکھو جو میں آگے دکھاتا ہوں
مری ہر ''سین'' پر نظریں ہیں
کب کتنا چھپانا ہے
کہاں کتنا دِکھانا ہے
کہانی کو کدھر سے موڑ دینا ہے
پرانی داستاں اندر یہ منظر کس جگہ پر جوڑ دینا ہے
یہ سب کچھ جانتا ہوں میں
تمہارا کیا؟ ذرا سے بیچ کے کردار ہو تم سب!
تو بس اتنی غرض رکھو
کہاں آغاز تھا، انجام کب ہوگا
تمہیں پوری کہانی سے کوئی مطلب؟
تمہیں تو جلد ہی میں مار ڈالوں گا
کہانی کار بھی میں ہوں!
ہدایت کار بھی میں ہوں!

OOO

علیم صبا نویدی (انڈیا)

نظمیں

آئینہ ہے زِندگی
آخری سانسوں تلک ہے آرزو
قبر تک ہے بندگی

O

جگنوؤں کی کہکشاں
مُسکراتا جگمگاتا گاؤں ہے
رات کا دِل کش سماں

O

دور تک منظر حسیں
تتلیوں کے اَن گنت رنگ گھاس پر
اور معطّر ہے زمیں

OOO

کرشن پرویز (انڈیا)

قطعات

کیا کہوں؟ کچھ سمجھ نہیں آتا
دل فسردہ ہے آنکھ بھر آئی
کھو دیا آج ہم نے وہ ہیرا
ایک دنیا تھی جس کی شیدائی

دل پریشاں ہے آنکھیں پُرنم ہیں
سب ہی دل میں لئے ہوئے غم ہیں
کل تلک جو شریکِ محفل تھے
آج وہ لوگ محوِ ماتم ہیں

دردِ دل کس طرح عیاں ہو گا
غم چھپانا تو میری عادت ہے
آپ کچھ اور ہی سمجھ بیٹھے
مُسکرانا تو میری عادت ہے

تنگ آ کر جناب بیچی ہے
باوجود اجتناب بیچی ہے
شعر جیسی حسین بوتل میں
اپنے خوں کی شراب بیچی ہے

خونِ قلب و جگر کو پی پی کر
چاک دامن کی دھجیاں سینا
ہم ہی زندہ ہیں زخم کھا کر بھی
ورنہ کوئی مذاق ہے جینا

یوں ستانے کو لوگ کیا کم تھے
دل جلانے کو لوگ کیا کم تھے
کیا ضرورت تھی اس تکلّف کی
گُل کھلانے کو لوگ کیا کم تھے

کون سمجھا حیات کا مقصد
کس نے رازِ ممات پائے ہیں
زندگی کے حسین دامن پر
موت کے خوفناک سائے ہیں

OOO

سیفی سرونجی (انڈیا)

رہنما

وہ کوئی قافلہ سالار تو نہ تھا
لیکن نجانے کیوں
ایک بھیڑ
اس کے اردگرد جمع تھی
جو اس کے ایک اشارے پر
جان دینے کو تیار تھی
اس نے اپنی سریلی باتوں سے
لوگوں کے ذہنوں کو
زہر آلود کر دیا تھا
لیکن اچانک ہی اس پر
ایسا زوال آیا
کہ وہ
گمنامی کے پردے میں
روپوش ہو گیا
اور اس کے تمام حواری
کسی دوسرے رہنما کی تلاش میں
سرگرداں تھے

غلام الثقلین نقوی

میں ابھی نرسری میں پڑھتا ہوں

میں ابھی نرسری میں پڑھتا ہوں
ابھی الف با جیم پر بھی نہیں پہنچا
رہوارِ عمر نے پچھتر منزلیں طے کر لی ہیں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
یہ غالب کا تصوّرِ زمان و مکاں ہے
وہ تو عرش سے پرے اپنا مکان بنانا چاہتا تھا
کہ بلندی پر ایک اور منظر قائم کرے
مَیں تو عرش کی بلندی پر پہنچ کر ببّل کی آنکھ سے
اس منظر کو دیکھ رہا ہوں
جس کا غالب خواہش مند تھا
لاکھوں نوری سال کے فاصلے طے کر چکا ہوں
کہیں کسی سیارے کو بلیک ہول میں غرق ہوتے
دیکھ رہا ہوں
کہیں کسی کہکشاں کو جنم لیتے
دیکھ رہا ہوں
اپنی کہکشاں کو کب کا عبور کر چکا ہوں
اور اس نقطے پر بھی پہنچ چکا ہوں
جہاں وقت لا تھا اور لا میں
پوری کائنات چھپی ہوئی تھی
لیکن یہ لا کہاں سے آیا
الف بائے جیم کی منزل تو اس کے بعد آئے گی
میں ابھی نرسری میں پڑھتا ہوں

(نثری نظم۔ مدینہ منورہ میں لکھی گئی)

صفدر صدیق رضی

پرواز

میں دیگر پرندوں کی مانند
بارش سے بچ کر
گھنیرے درختوں کی شاخوں
پہاڑوں کی پوشیدہ گہری پناہوں
گھنی وادیوں
ان کی مُستور گہرائیوں
یا مکانوں کی اُونچی منڈیروں
کے اوجھل کناروں میں
چُھپتا نہیں ہُوں
سو میں ابر و باراں سے اُوپر فضا میں کہیں
محوِ پرواز رہتا ہُوں!

OOO

نیر رانی شفقؔ

خواہشوں کا سفر

شکوہ ہو قسمتوں سے
خاموش آسماں سے
یارانِ کارواں سے
بدلے ہوئے جہاں سے
راہِ وفا سے لیکن
صدق و صفا سے لیکن
جُود و سخا سے لیکن
ہم ہاتھ مت اُٹھائیں
نغمے وفا کے گائیں

دنیا دُکھوں کا گھر ہے
جو بھی یہاں بشر ہے
مثلِ حُباب ہے وہ
پاگل کا خواب ہے وہ
اب فرض ہے ہمارا
اس قریۂ جہاں میں
سچ کے دیے جلائیں
اس کارزارِ غم کو
جنت نشاں بنائیں

سچ کے ہُنر کی خاطر
سب زخم دل پہ کھائیں
بے رنگ آسماں پہ
رنگِ شفقؔ سجائیں

عمر برناوی

گیت

ہے ری سکھی میں کیسے بھولوں یاد نہ بھولی جائے
میرے پیا کی سندر صورت من درپن میں آئے

پونم چندا جیسا مُکھڑا لمبے اُن کے کیس
مجھ برہن کو چھوڑ کے بالم چلے گئے پردیس
پگلی پَون اب تو ہی جا کر دے دے یہ سندیس
کالی گھٹائیں ٹوٹ کے برسیں ساون بیتا جائے
میرے پیا کی سندر صورت من درپن میں آئے

تم بن ساجن پاگل من کو کیسے آئے چین
راہ نہاروں سانوریا میں تڑپت ہوں دِہ رَین
ساون بھادوں مورے نینا من کرتا ہے بین
کیوں سجنی کو بھولے بیٹھے کیسا ہے اَنیائے
میرے پیا کی سندر صورت من درپن میں آئے

میں نے مانا پیٹ اہم ہے یہ تو سوچو میت
کیا کہتی ہے جیون بینا کیا ہے اُس کا گیت
چار دنوں کا یہ میلہ ہے پھر سونا سنگیت
پریت کی تان ہی سب سے میٹھی دیکھو ٹوٹ نہ پائے
میرے پیا کی سندر صورت من درپن میں آئے

ہے ری سکھی میں کیسے بھولوں، یاد نہ بھولی جائے
میرے پیا کی سندر صورت من درپن میں آئے

OOO

نوید قتیل

گیت

گوری تیرے بن تیرے بن سُونا لگتا ہے میرے گھر کا
آنگن گور تیرے بن

گھر سے تو اپنے جب ہوگی بیدار
ماں اپنے دل سے تجھے دے گی دُعا
پیا گھر جا کے سکھی رہنا سدا۔ سکھی رہنا سدا
آئے گی ڈولی جب میرے آنگن
مہک اُٹھے گا میرے گھر کا گلشن
ناچ اُٹھے گی میرے دل کی دھڑکن
میرے دل کی دھڑکن
پیار تجھے اتنا میں دوں گا سدا
بابل کی تجھے یاد آئے نہ ذرا
کر دوں تن من اپنا فدا۔ من اپنا فدا
گوری تیرے بن.....

OOO

گورے کالے

عزیز میرٹھی

قدرت کی طرف سے مجھے گہرا سانولا رنگ عطا ہوا ہے۔ چمپئی رنگت کی حسیناؤں کے جھرمٹ میں عمر گزری ہے۔ لیکن میں اپنی ساری زندگی میں کہیں بھی اور کبھی بھی کلر کمپلیکس کا شکار نہیں ہوا۔ خوبصورت عورتوں سے ہمیشہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کیں۔ مقابل کی توّجہ ایک پل کے لئے بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہونے دی۔ تا آنکہ اُنہوں نے گردن جھکا کر اپنی آنکھوں پر ریشمی پلکوں کی چلمن نہ ڈال دی۔

رنگ اور خدوخال کے معاملے میں کوئی بندھا ٹکہ اصول نہیں ہے۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ اہلِ ہند تو جادوگر بنگالیوں کے سانولے رنگ اور تیکھے نین نقش کے شیدائی ہیں۔

ایک ہیروئن نے ایک بار شوٹنگ کے دوران مجھ سے کہا۔

''عزیز صاحب خدا نے آپ کو اتنی خوبیاں عطا کی ہیں' اگر کہیں رنگ میں بھی تھوڑی سی فیّاضی سے کام لیتا تو بائی گاڈ! آپ میرے آئیڈیل ہوتے۔''

میں نے بلا جھجک جواب دیا۔

''محترمہ اپنے گورے رنگ پر اتنا مان نہ کریں۔ اس کی ساری قیمت شباب و جوانی کی مرہونِ منت ہے۔ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ سارا رنگ روپ ملیامیٹ ہوجائے گا۔ چاہنے والا ڈھونڈے نہ ملے گا۔''

بُرا ماننے کی بجائے وہ میری کھری کھری سُن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہاہاہا..... ہاہاہا۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔''

''لیکن میرا رنگ کبھی تبدیل نہ ہوگا۔ اس لئے وقت گذرنے کے ساتھ میری قدر و قیمت میں کوئی کمی نہ ہوگی' بلکہ مزید اضافہ ہوگا۔ اتنا ہی نہیں اگر تمہارے رنگ کے چند چھینٹے میرے منہ پر آ پڑیں تو میں بدشکل کہلاؤں گا۔ دیکھنے والے مجھے پھلبہری کا مریض جانیں گے۔ اور اگر میرے رنگ کی ایک بہت ہی ننھی منی سی بوند تمہارے چہرے پر جا پڑے تو تمہارے حُسن زیبا میں چار چاند لگا دے گی۔''

''واہ وا۔ واہ وا کیا شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ آپ کی انہیں باتوں پر تو ہم جان دیتے ہیں۔''

ایک دوسرے موقع پر جب میں اپنی دوسری فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھا، حُسنِ اتفاق سے وہی میری ہیروئن تھیں۔ ایک خوبرو ایکسٹرا لڑکی بڑی مدّت سے میرے پیچھے پڑی تھی کہ میں اُسے فلم میں کوئی چھوٹا موٹا رول دے دوں۔ اُس کی بڑی بیوہ بہن کئی بار میرے لئے گھر سے کھانا بنا کر لائی۔ میں نے اُسے منع بھی کیا کہ یہ بات مجھے قطعاً پسند نہیں۔ مگر انہوں نے میری بات نہ مانی۔ آخر کار ان کے پیہم اصرار اور مِنّت سماجت سے تنگ آ کر اس لڑکی شکیلہ کو ایک چھوٹا سا رول دے دیا۔ آج کا ایک مشہور و معروف ہدایت کار میرا شاگرد اور چیف اسسٹنٹ تھا۔ کسی منفی، چالاک اور ہوشیار آدمی کے لئے اُردو زبان میں ایک ضرب المثل مشہور ہے..... ''اُسے تم کیا سمجھتے ہو وہ تو اُڑتی چڑیا کے پَر گنتا ہے۔ وہ جتنا اُوپر ہے اُتنا ہی زمین کے نیچے بھی ہے۔'' مگر میرا شاگرد اقبال کشمیری پورے کا پورا انڈر گراؤنڈ ہے۔ اوپر اُس کا سایہ ہی گھومتا پھرتا ہے اور سایہ کسی کے قابو میں نہیں آتا۔

ایک روز جب مجھے ہیروئن کا رومانٹک سین پکچرائز کرنا تھا۔ وہ غریب اپنی بہن کے ہمراہ سیٹ پر آ کر خاموشی سے کونے میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میری نظر پڑی تو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ میں بھی اشارے سے جواب دے کر سکرپٹ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ اشاروں میں سلام جواب ہیروئن نے دیکھ لئے اور اقبال کو آواز دی۔

''اقبال!!!'' ''ذرا یہاں آؤ!''

وہ کرسی پر بیٹھی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔

''جی میڈم!'' اقبال نے قریب آ کر کہا۔ ہیروئن نے بھنویں چڑھا کر اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ لڑکی کون ہے؟'' اس شریر نے کہہ دیا۔

''وہ..... ہمارے باس کی منظورِ نظر ہے۔''

''اچھا..... جبھی تو یوں ٹھسے سے کرسی پر جمی بیٹھی ہے۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ میرٹھی صاحب تو کسی کو اپنے سیٹ پر آنے نہیں دیتے' یہ کیا بلا ہے جو منہ اُٹھائے سیدھی ہی چلی آئی۔''

کیمرہ مین کو لائیٹس سیٹ کرنے کا کہہ کر میں نے اسے سین سمجھانے کے لئے کیمرے کے پاس بُلایا تو اس نے سکرپٹ میرے ہاتھ سے چھین کر کہا۔

''چھوڑیں جی! آپ بھی ایسے ہی ٹیں ٹیں فِش ہیں۔''

میں نے کوئی توجہ نہ دی اور سکرپٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ تو اس نے پھر کہا۔

''کیا مطلب؟''

''اندھوں کی طرح اُجڑے بچڑے کھنڈرات میں بھٹکتے پھرتے اور گدھوں کھائیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا اس شطونگڑے نے اس کے کان میں پھونک ماری ہے۔ میں نے برملا کہا:

''کیا کروں کوئی راستہ سمجھانے والا جو نہ ملا۔''

''آپ نے کبھی راستہ پوچھا ہے؟'' اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

یقین جانیں اگر اس لمحے میں ذرا سی ڈھیل دیتا تو وہ میری بیوی بن چکی ہوتی مگر میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''پوچھ لیں گے کبھی۔ چلئے اب ڈائیلاگ یاد ہو گئے ہوں تو شاٹ لیں''

چند روز بعد میں گانے کی شاٹ ڈویژن چیک کر رہا تھا۔ ڈانس ڈائریکٹر ماسٹر صدیق سمراٹ ہیروئن کو شاٹ کی ریہرسل کرا رہا تھا کہ میرے کانوں میں ہیروئن کی اونچی آواز آئی۔ اقبال!!!

''جی میڈم!'' تھوڑے فاصلے سے اقبال نے جواب دیا۔

''کرسی دو تمہاری اُستانی آئی ہے۔'' میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ سیٹ کے کونے میں کھڑی تھی اور ساتھ ہی اُس کی بہن۔ اقبال نے بڑی پھرتی سے ایک کرسی لا کر اس کے پاس رکھ دی۔ اُس نے اپنی بہن کو جیسے اُس کی مرضی کے خلاف زبردستی کرسی پر بٹھا دیا ہوا اور خود سکڑ سمٹ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے اُسے آواز دی۔

''شکیلہ اِدھر آ ذرا!''

''وہ پُھدک کر کرسی سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی، لبوں پر مسکراہٹ لئے میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا۔ بغیر کام کے سیٹ پر نہ آیا کرو۔ جب تمہاری ضرورت ہو گی بلا لوں گا۔''

اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔

''اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔ تم تو گلے کا ہار بن گئی ہو۔ تم نے کام مانگا۔ میں نے تمہیں کام دے دیا۔ آگے کوئی پکچر کروں گا تو اس میں بھی ایڈجسٹ کر لوں گا۔ بس اور مجھ سے کیا چاہتی ہو تم؟''

''باجی'' آپ کے لئے کھانا لائی ہیں۔'' اس نے گھٹی گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے کھانا نہیں چاہیئے۔ میں تو کسی سے ایک سگریٹ' پان یا چائے کے ایک کپ کا بھی روادار نہیں ہوں۔ سمجھیں' اب آپ جائیں۔'' میرا لہجہ قدرے تلخ تھا۔ اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کوئی اُسے سیٹ پر ذلیل ہوتے تو نہیں دیکھ رہا۔ اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر میں کیمرے میں فریم دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک سکتے کے عالم میں وہیں کھڑی تھی۔ چند لمحہ بعد میں نے کیمرے سے آنکھ ہٹا کر دیکھا وہ وہاں نہیں تھی۔ کرسی بھی خالی پڑی تھی۔

اس واقعے کے چند روز بعد ہیروئن نے فون پر مجھے اپنے بنگلے پر ڈنر کی دعوت دی۔ میں نے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر اس کے اصرار پر ہاں کرنی پڑی۔

ڈرائنگ روم کسی مسحور کن خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس روز وہ ضرورت سے زیادہ سجی سنوری نظر آئی۔ لیکن کچھ اداس۔

کھانے میں کوئی خاص دلچسپی نہ لیتے ہوئے بہت ہی مایوس کن گفتگو کرتی رہی۔اپنی تنہائی کا رونا روتی رہی۔کھانا بے رغبتی سے صرف میرا ساتھ دینے کے لئے جیسے زہر مار کرتی رہی۔ یہ سب کچھ میرے ئے خلافِ توقّع تھا۔ میں تو اُس کی دعوت قبول کرنے کے بعد کچھ اور ہی سوچتا رہا۔ڈرائنگ روم میں پھیلی ہوئی خوشبو کے ساتھ مدھم مگر بڑی رومانٹک لائٹس روشن تھیں۔اتنی مدھم روشنی غالبًا اسی حالت پر پردہ ڈالنے کے لئے کی گئی مگر وہ اس میں کامیاب نہ تھی۔ چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے ایک لمبی سرد آہ کھینچی۔

''اب تو سچ مچ اکیلے پن سے دل بہت گھبرانے لگا ہے۔''

''اتنی مایوسی بھی اچھی نہیں میڈم.....''میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کھانے سے فارغ ہو کر میں جانے کے لئے کرسی سے اُٹھا۔کلاک بارہ بجا رہا تھا۔

''اوہ بارہ بج گئے۔آپ سے باتوں میں پتہ ہی نہ چلا۔لگتا ہے وقت کو پر لگے ہیں اچھا اب اجازت.....''اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ذرا ٹھہریئے۔مجھے آپ سے.....کچھ کہنا ہے۔''

''کہیئے۔''

وہ میرا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس لے گئی۔اس کے سراپے سے وہی مخصوص خوشبو آ رہی تھی جس میں کچھ نشہ آور سی کیفیت تھی۔اس نے کھڑکی پر پڑا ہلکا گلابی ریشمی پردہ ہٹا دیا۔سامنے آسمان پر چودھویں رات کا پورا چاند ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔نیلگوں چاندنی میں اسکی آنکھیں چمک اُٹھیں،جن میں خفیف سی نمی چھلک رہی تھی۔آنکھوں کو یہ کیفیت کبھی کبھی انسان کے جذبات کو بھڑکا کر اندھا کر دیتی ہے لیکن میرے جذبات پُرسکون تھے۔اُن میں کوئی ہلچل نہ تھی۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آیا۔ اس نے میرا گرم ہاتھ اپنے دونوں سرد ہاتھوں میں تھام کر زور سے دبایا۔جیسے آج اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا ہو۔ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔حُسن و جمال کی انا ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہو۔

''عزیز میں نے کئی راتیں اسی سوچ میں جاگ کر گذار دیں کہ مجھے آپ کا ہو جانا چاہئے۔ مجھے اپنا بنا لیجیے پلیز!!''یہ کہہ کر اُس کے گلاب کی پتیوں ایسے پھیلتے ہوئے ہونٹ جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی، کچھ تھرتھرانے لگے۔

''ارے.....کیا آپ کو معلوم نہیں۔میں شادی شدہ ہوں؟''

''جانتی ہوں.....لیکن شرع میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔آپ کیا دو بھی نہیں کر سکتے؟''

''لیکن کیا تم یہ برداشت کر لوگی۔سوکن کا جلاپا نہ ہوگا؟

''سوکن کیسی ہم دونوں بہنوں کی طرح رہیں گی.....''

''دیکھو اس وقت تم جذبات کی رو میں بہہ رہی ہو۔سوچ لو کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔''

''ہوسکتا ہے اس روز میں بھی جذبات کی رو میں بہہ جاتا لیکن ہاں کرنے کی راہ میں دو بڑی وجوہات حائل تھیں،ایک تو

یہ کہ مجھے اپنی بیوی سے اتنی گہری محبت تھی کہ جنت سے کوئی پری بھی اُتر کر میرے پاس آتی تو میں اسے نفرت سے ٹھکرا دیتا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کئی دوسرے ہدایت کاروں کے برعکس (دور کیوں جائیں) خود میرے شاگرد نے تین شادیاں کی تھیں، بظاہر تین اور باطن کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔ میرا ضمیر یہ ذلّت برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ منکوحہ بیوی کو سجا بنا کر غیر مردوں کے سامنے اس کا مجرا کراؤں' چاہے وہ فلم کے پردے پر ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے مردوں کے ساتھ اس کے رومانی مناظر پکچرائز کروں۔ چاہے وہ حقیقت نہ ہو محض اداکاری ہو۔ اس کے لئے بڑے دل گُردے کی ضرورت ہے۔ زہر کا یہ پیالہ میں کسی قیمت پر نہیں پی سکتا تھا۔ اتنی دیر روح فرسا خاموشی کے بعد اُس نے پھر سکوت توڑا۔

''خاموش ہو گئے۔ میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''میرا جواب یہ ہے.....'' اس نے اُمید و بیم کی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں۔ ہاں۔ کہئے نا۔ رُک کیوں گئے؟''

''میں تم سے شادی کے لئے تیار ہوں۔''

''مجھے یقین تھا تم انکار نہیں کرو گے۔ عزیز! مجھے اپنی بانہوں میں لے لو۔ تھام لو مجھے میں بے ہوش ہو کر گر نہ پڑوں؟

''گھبراؤ نہیں میں نہ خود گروں گا نہ تمہیں گرنے دوں گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ شادی کے بعد اداکاری نہ کر سکو گی۔ تمہیں شمعِ محفل نہیں چراغِ خانہ بن کر زندگی گذارنا ہو گی۔'' وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی۔ مگر میں نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ چند لمحے سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر ایک جھٹکے سے سر اُٹھا کر میری طرف زہر بھری آنکھوں سے دیکھا اور تیزی سے اپنے بیڈ روم میں جا کر دروازہ زور سے بند کر دیا۔ میں آگے بڑھ کر دروازے تک گیا۔ چند لمحے کچھ سوچا پھر دستک دینے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ مگر کسی غیبی طاقت نے اتنی قوّت سے میری کلائی پکڑی کہ میرا ہاتھ کپکپانے لگا۔ سر جھٹک کر میں نے خود پر قابو پایا اور تیز قدموں سے ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔ بنگلے سے چند قدم آگے جا کر میں پل بھر کو رُکا۔ مڑ کر دیکھا۔ بنگلے کی ساری لائٹس ایک دم گُل ہو گئی تھیں۔

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

اظہر میں جان بوجھ کے رہتا ہوں بے خبر
ہر یار مرا کُھل کے ذرا وار کر سکے

انشورنس

ثمینہ سیّد

''عجب خوف و ہراس کی فضا ہے فصیح! دل چاہتا ہے اپنے بچوں کو گھر سے ہی نہ نکالوں بس سینے کے ساتھ بھینچ کے رکھوں اپنے جگر گوشوں کو'' ثمر نے لرزتی آواز میں کہا اور فصیح سپاٹ چہرہ لئے اسے دیکھتا رہا۔ ''فصیح ان لوگوں کو ترس نہیں آتا، کتنے معصوم لوگ ان کی ضد اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں'' ہوسکتا ہے مجبوری ہو'' وہ کھوئی ہوئی سی آواز میں بولا:

''فصیح'' ثمر چیخ اُٹھی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

''فصیح یہ نفرت ہے، تباہی ہے''۔

''مجبوری بھی تو ہوسکتی ہے جانو، محبت کی مجبوری''۔

''فصیح آر یو میڈ؟'' وہ پھر چلاّئی تو فصیح نے اس کے سرد ہاتھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا مگر وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی اور رونے لگی، ''وہ ہمارے بچّے ہیں فصیح، ہمارے بھائی، باپ بہنیں، مائیں ہمارے اپنے، ہر فرد مضطرب ہے۔ ایسے لگتا ہے جو باہر جائے گا وہ یقیناً لوٹ کر نہیں آئے گا۔ بچوں کو سکول بھیجتی ہوں تو دن بھر تڑپتی رہتی ہوں، کہیں ہلکی سی آہٹ بھی ہو جائے تو دل مچل کر سینے سے باہر آنے لگتا ہے۔ یا اللہ، میرے بچوں کی خیر ہو، دروازے تک پہنچتی ہوں تو سو بار مرتی ہوں اور تم انہیں حق بجانب کہتے ہو'' وہ روتے روتے بول رہی تھی اور فصیح چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

''ثمر! بخدا میں دہشت گردوں کو حق بجانب نہیں کہہ رہا، میری جان! مگر وہ جو اپنی چھاتی پر بم باندھ کے آتا ہے وہ غربت کے ہاتھوں مجبور ہوسکتا ہے، اس کے اس فعل کے بدلے میں اس کی فیملی کے حالات بدل جاتے ہوں گے، ہوسکتا ہے اس کی سات جوان بہنیں ہوں، ہوسکتا ہے بچہ بیمار ہو، ہوسکتا ہے وہ کسی بہت بڑے سانحے کا بدلہ لے رہا ہو''۔

''فصیح پلیز، کسی بھی صورت اس کو سینکڑوں جانیں اپنے ساتھ ختم کرنے کا کوئی حق نہیں'' ثمر نے بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے فصیح کو گھورا، چند لمحے خاموشی چھائی رہی، نجانے کیوں فصیح کے پاس لفظ ہی ختم ہو گئے تھے اور ثمر کلستی رہی۔ پھر پھنکار کر بولی۔ ''اگر وہ اتنا ہی مجبور اور لاچار ہے تو اپنوں کے دُکھ ختم کرنے کی مثبت کوشش نہیں کرسکتا تو خودکشی کر لے۔ کسی کے مر جانے سے زندگی نہیں رکتی، فصیح! پچھلے خود ہی پل جاتے ہیں مگر کسی خودکش بمبار کے رشتہ دار ہونے کے احساس سے وہ جی نہیں پاتے، سر

تک نہیں اٹھا پاتے، اپنے پیارے بچے یا بھائی کی جدائی اور احساس جرم انہیں خودکش حملے کے بدلے میں ملی ہوئی دولت انجوائے نہیں کرنے دیتا۔ فصیح! تم نیگیٹو کیوں ہو رہے ہو'' وہ اس کو جھنجھوڑ کر بولی تو وہ اس کے شانے پر سر رکھ کے رو دیا۔

''ثمر میں بہت ڈسٹرب ہو رہا ہوں، میں تو صرف غربت کے ہاتھوں پیدا ہونے والے جرائم کی بات کر رہا ہوں، میری جان میں کیسے ظلم کا ساتھ دے سکتا ہوں۔ میں تو صرف اپنی پیاری سی فیملی کو ذرا ذرا سی ضرورتوں کیلئے تڑپتا سسکتا دیکھ کر پریشان ہوں۔ تم یقین کرو میں زندگی کو آسان کرنے کی تگ و دو میں ہلکان ہو رہا ہوں، اعصابی طور پر نڈھال ہوتا جا رہا ہوں ثمر''

''تم نے کبھی میری تحریم، عمر، عذیر کے پیلے چہرے اور کمزور جسم دیکھے ہیں۔ ان کے بوسیدہ کپڑے جو تمہاری شدید کوششوں سے بس صاف رہتے ہیں اور تحریم جو رات بھر نائٹ کلاس کے میتھس سے لڑ رہی ہوتی ہے''۔

''میں کیسا باپ ہوں ثمر ایک ٹیوشن تک نہیں رکھ کے دے سکتا اور عذیر اسے اپینڈکس کا درد ہوتا ہے تو ثمر ہم سب مرتے ہیں مگر ایک چھوٹا سا آپریشن نہیں کروا سکتے اور عمر.....'' اس کی آئی سائیٹ دن بدن ویک ہوتی جا رہی ہے ایک عینک تک تو ہم افورڈ نہیں کر پاتے''، وہ ہارتے ہوئے انداز میں بول رہا تھا اور ثمر کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ کتنی بے رحمی سے سب حقیقتیں بے نقاب کر رہا تھا، پھر اس نے پیچھے ہٹ کر ذرا سی سانس ہموار کی اور اپنے ہاتھوں سے ثمر کے الجھے، بکھرے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت ہی شکستہ انداز میں بولا، ''ثمر یہ خواب تو ہم نے نہیں دیکھے تھے، تمہیں یاد ہے کہ کیمپس کے سرسبز، خوشنما منظر میں ہم گھنٹوں بیٹھے خوبصورت سپنوں کی جنت میں گم رہتے تھے۔ ثمر! ایک پوری جنت تھی جو ہم نے وہاں بیٹھ کر تشکیل دی تھی۔ لمحہ لمحہ پورے خلوص اور جوش و جذبے سے، کتنی قوت کتنی خوشی تھی ہمارے اندر دنیا کو تسخیر کر لینے کی اور.....اور''

''ہماری محبت جیت بھی تو گئی فصیح! سارے رسم و رواجوں کی نفی کر کے ہم نے ایک دوسرے کو پا بھی تو لیا' مجھے تمہارے وجود میں پناہ مل گئی' تم پل پل نظر کے سامنے ہو اس سے بڑھ کر کیا چاہیے فصیح! ہمارے پیارے بچے ہماری محبت کی خوبصورتی اور زندگی کا ثبوت، اس کے آگے سب ہار گئے سب کچھ''

''نہیں ثمر نہیں''، فصیح نے اس کی ناک کو بہت ہی پیار سے دبایا۔

''ہار تو ہم بھی گئے۔ جیت کر بھی ہار گئے۔ ہمارے خواب ریزہ ریزہ ہونے کو ہیں، ہماری جنت پہ غربت کی سیاہ کالی رات چھا رہی ہے، تم یقین کرو میں نے ایک ایک لمحہ کوشش کی کہ تم لوگوں کو بہترین زندگی دے سکوں، تمہارے سامنے ہے سب کچھ۔ اوور ٹائم بھی کرتا ہوں اور وہ سارا وقت جو ہماری پلاننگ کے مطابق' ہمارے گھومنے پھرنے، رشتہ داروں کو ملنے، اپنے شہزادوں کو پرآسائش زندگی دینے اور ایک دوسرے کو ٹوٹ کر پیار کرنے کا وقت تھا وہ ہم نے اس مینجمنٹ کی نظر کر دیا۔ پھر بھی کچھ میچ نہیں ہو پایا۔ کچھ بھی نہیں''۔

اس کا ہر ہر لفظ رو دیا تو ثمر نے پیار سے اس کی آنکھوں کو اپنے آنچل کے کونے سے صاف کیا اور بہت پیار سے بولی ''فصیح'' اس قدر دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ساتھ تو ہیں ناں اور ہماری محبت پر حالات اثر انداز نہیں ہو سکتے''

''محبت''، فصیح استہزائیہ انداز میں بولا:

''محبت سارے حالات کے نیچے دب گئی ہے۔ تم مجھے دلا سے مت دو' کتنے سال ہوگئے ہمیں حالات کو بہتر کرنے کیلئے بھاگتے دوڑتے محنت کرتے۔ کتنے سال ہوگئے ہمیں پوری سچائی سے صرف محبت کئے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھے، ''آئی لو یو' بولے، ثمر! تمہیں یاد ہے میں تمہاری ہنسی کا دیوانہ تھا۔ لگتا تھا تمہارے قہقہے سے وقت کی گردش تھم جاتی ہے اور اب؟''

وہ رکا۔ ثمر نے انگلی سے آنسو پونچھا جو نوک مژگاں پہ دھیرے سے آٹھہرا تھا۔

''کتنے سال ہوگئے ثمر! تمہیں کھل کے ہنسے ہوئے'' وہ پاس چلا آیا تو ثمر اٹھ کے اسکی بانہوں میں سما گئی ''فصیح میں خوش ہوں، مجھے تمہاری ضرورت تھی۔ تم ہو اور میرے بچے، میری جنت، فصیح میں حالات کی تنگدستی سے نہیں گھبرا رہی۔ میں تو ملکی حالات سے ان سیکیور ہوں۔ تم لوگوں کی زندگیوں کیلئے پریشان ہوں'' وہ پیچھے ہٹی اور چیزیں سمیٹتے ہوئے پھر بولنے لگی، بس کرو اور سو جاؤ آج کیلئے اتنا اظہار محبت کافی ہے، میں ذرا بچوں کو دیکھوں، دروازوں پر نظر مار آؤں''

وہ چلی گئی مگر فصیح بیڈ پر ڈھے سا گیا وہ اپنی اور ثمر کی محنت کا حساب کرتے کرتے تھک جاتا تھا اسے ہر وقت یاد رہتا جب انہوں نے یونیورسٹی کے بعد کورٹ میرج کر لی تھی تو دونوں کے خاندانوں نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تب وہ بہت اپ سیٹ تھے بالکل خالی ہاتھ تھے مگر دل محبت کے نشے سے مخمور تھا۔ نس نس میں جیت ہی جیت تھی۔

فصیح جاب کیلئے کوشش کر رہا تھا اور پھر فصیح کو ایک اخبار میں اسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر جاب مل گئی۔ یہ بھی بہت تھا، اس کے پاس تجربہ تھا نہ سفارش اور پھر ایک پیاری سی خوشخبری نے دونوں کو ہر دکھ سے آزاد کر دیا، نئے مہمان کی آمد کی خوشخبری نے فصیح کے پاؤں میں پر لگا دیئے۔ اس نے چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا اور ثمر سے جاب چھڑوا دی۔

''ثمر ہم اپنی محبت کی پہلی نشانی کی ذرا سی بھی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے تم ریسٹ کرو بس مجھے چاہو مجھ سے پیار کرو اور ہر وقت آئینہ دیکھا کرو تاکہ میری بیٹی بالکل تمہارے جیسی ہو''۔

''بیٹی کیوں؟ ثمر نے بھنویں چڑھائیں تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا ''واہ! کیسا انداز ہے''۔

''بس سویٹ ہارٹ پہلے بیٹی پھر بیٹا پھر بیٹا پھر''۔

''فصیح''، ثمر زور سے چلائی اور وہ ہنستا ہی رہا۔ اس کی یہ پیاری اور معصوم سی خواہش تو اللہ پاک نے فوراً ہی سن لی۔

تحریم کے پیدا ہونے سے دو ماہ پہلے اس نے اوور ٹائم کرنا شروع کیا تھا جو آج تک کر رہا تھا مگر آج کی شدید محنت ناکافی تھی اس کی پیاری سی فیملی کیلئے۔

''یار اس دفعہ تو انشورنس کی قسط دینا بھی مشکل ہوگیا ہے''، اطہر فاروقی کرسی کھینچ کر فصیح کے پاس آ بیٹھا تو فصیح بھی کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور بولا ''یار یہی بڑی بات ہے کہ تو نے دوسرے تمام خرچوں کے ساتھ انشورنس بھی کروالی ہے، اللہ خیر کرے گا کوئی صورت بن ہی جائے گی''۔

''کیا صورت بنے گی فصیح! اس قدر مہنگائی ہے کہ بس لگتا ہے یہ سب سے بڑی آفت ثابت ہوگی اس صدی کی۔''

''یار روز تو حادثے ہوتے ہیں اسی لئے میں نے انشورنس کروا ڈالی کہ خود مر بھی جاؤ تو فیملی کو کچھ فائدہ تو ہو۔ دوسروں کی محتاجی تو نہ ہو''، اطہر کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر فصیح کو سنائی نہ دے رہا تھا وہ اٹھ کر باہر گیلری میں چلا آیا، آوازوں کی بازگشت نے اس کے اعصاب کو سن کر دیا تھا۔ ''اگر وہ اتنا ہی مجبور اور لاچار ہو کہ اپنوں کے درد ختم کر سکے اور برداشت نہ ہو تو خودکشی کر لے'' یہ ثمر کی آواز تھی اور اطہر ''یار خود مر بھی جاؤ تو فیملی کو کچھ تو فائدہ ہو''، ''فصیح میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتی باقی سب تو عارضی ضرورتیں ہیں، تمہاری محبت سے بڑی نہیں ہو سکتی''، ثمر کی آواز نے روشنی ہی روشنی کر دی مگر ''پاپا مجھے تو لگتا ہے ہم دنیا کی سب سے غریب فیملی ہیں' دوستوں سے فنکشنز سے ضرورتوں سے چھپتے پھرتے ہیں'' یہ تحریم تھی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو تھے ''پاپا آج سکول میں بھی شدید درد ہوا، ٹیچر کہہ رہے تھے اپینڈکس کا آخری حل آپریشن ہی ہے مگر'' یہ عذیر کی آواز تھی فصیح تڑپ کر اٹھا۔ نجانے کون سا فیصلہ تھا جو پل بھر میں ہو گیا۔

وہ اندر چلا آیا اور ''لون'' کیلئے درخواست لکھنے لگا۔ بہت دردناک وجوہات لکھ ڈالیں کہ تین چار دن میں لون مل بھی گیا وہ ادارے کا سینئر ممبر تھا۔ سب اس کی عزت کرتے تھے، فصیح نے لون کی رقم سے انشورنس کروا دی، پچاس لاکھ کی انشورنس پالیسی اور پھر کچھ رقم بچا کر ثمر اور بچوں کو سیر کروائی، رات کو آئسکریم کھلانے کے گیا، جیسے اس کو اطمینان تھا کہ مستقبل محفوظ ہے۔ وہ تحریم کا نجانے کتنی بار ماتھا چومتا، عمر اور عذیر کو بانہوں میں بھر کر بار ہا پیار کرتا رہا۔ ان کے کانوں میں ماں سے وفاداری اور بڑے آدمی بننے کی ہدایات ڈالتا چلا گیا تو ثمر کھلکھلا کر ہنس پڑتی ''فصیح تم خوش بھی ہو تو ڈر لگتا ہے'' وہ بھی ہنسا اور قریب چلا آیا ''اگر میں ملک سے باہر چلا جاؤں تو؟

''تو کیا ہوا ہم سب ہینڈل کر لیں گے نو دولتیوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے پیسہ اڑائیں گے'' ثمر نے یہ کہتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ وہ حیران تھا لیکن دوسرے ہی پل سب اس سے چمٹ گئے اور ثمر نے اس کا بازو پکڑ کر کہا ''فصیح ہمارے لئے تمہارا ساتھ زیادہ ضروری ہے، تمہارے بغیر ہم جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے''

مگر فصیح کو ثمر کی وہ آواز بھی سنائی دے رہی تھی جو اس نے کہا تھا ''کسی کیلئے کوئی بھی نہیں مرتا، زندگی رکتی نہیں، پیچھے رہنے والے پل ہی جاتے ہیں بس مرنے والا اپنی فیملی کیلئے شرمندگی کا باعث نہ بنے، سرخروئی اور سیلف رسپیکٹ سب سے زیادہ ضروری ہے'' وہ سب کو ہٹا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ لون کی کٹوتی کی وجہ سے یہ ماہ تو زندگی مزید مشکل ہو گئی۔ ثمر کو تقاضوں کی عادت نہ تھی مگر وہ بہت پریشان تھی۔

''فصیح میں جاب کر لوں، اب تو بچے ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہیں''۔

''نہیں سویٹ ہارٹ ایک دو ماہ مشکل ہیں، بس پھر میری پرموشن ہو رہی ہے۔ حالات ٹھیک ہو جائیں گے تم تو بہت بہادر ہو پھر یوں ہار کیوں رہی ہو، تم ہی تو میری ہمت ہو میرا مان، میرا یقین، مجھے تو لگتا ہے تمہارے حوصلے ماؤنٹ ایورسٹ جتنے

ہیں اور تم اکیلے بھی زندگی کو ہر طرح سے مینج کر سکتی ہو''

''فصیح، تم اتنا کیوں بولنے لگے ہو، آر یو آل رائٹ'' وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی تو وہ سکون سے مسکرا دیا۔

اور پھر اسکا خوفناک سکون سارے ماحول کو ساکت کر گیا، فصیح احمد اچانک ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گیا، ثمر تو اجڑ گئی، من خالی، دل ویران ہو گیا، آنکھیں جیسے کسی منظر میں اٹکی اٹکی پتھرا گئیں۔ فصیح نے زندگی میں لمحہ لمحہ ساتھ رہنے کے کتنے وعدے کیے تھے۔ تکلیف دہ جدائیاں دے رہا تھا۔ ثمر کو پچاس لاکھ انشورنس کی رقم مل گئی۔ آس پاس کے لوگ اسے سسکیاں لیتے دیکھ رہے تھے۔ فصیح نے زندگی بھر کی پلاننگ لکھ دی تھی۔

روپیہ اتنا تھا کہ بچوں کے سب مسئلے حل ہو گئے مگر ان کے چہروں سے زردی کیوں نہ گئی؟

◆◆◆

نذیر فتح پوری کی مرتبہ کتاب ''مے خانۂ اُردو کا پیرِ مغاں''

ہندو پاک کے معروف ادیب نارنگ ساقی پر ـــــ نذیر فتح پوری کی مرتّبہ کتاب ''مے خانۂ اُردو کا پیرِ مغاں'' کی تقریبِ رونمائی گزشتہ دنوں ساہتیہ اکادمی دہلی کے رابندر بھون میں ہوئی۔ اس تقریب میں اظہارِ خیال عالمی شہرت یافتہ ادیب، نقاد و محقق اور پاکستان کے 'ستارہ امتیاز' ایوارڈ یافتہ پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی، معروف ادیب نند کشور وکرم، معروف افسانہ نگار رتن سنگھ اور چندر بھان خیال نے کیا۔ اس موقع پر مشہور شاعر متین امروہوی نے ''رنگیلا ساقی'' کے عنوان سے نظم پیش کر کے نارنگ ساقی کو منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا جبکہ چندر بھان خیال نے بھی نارنگ ساقی کی ادبی خدمات اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے انہیں منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت میکش امروہوی نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا:

> ''ادب ایک طرح کی دیوانگی ہے۔ آرٹ، ادب و شاعری کی دنیا میں سب سے پہلے اور بنیادی چیز خلوص ہے اور اگر یہ خلوص نہیں تو کسی بھی تحریر میں تاثیر نہیں آ سکتی۔ یہی خلوص نارنگ ساقی میں پایا جاتا ہے جنہوں نے بے لوث، بے غرض اور بے نیاز ہو کر ادبا و شعرا کی مہمان نوازی کی۔ ان کی صحبت اختیار کی اور خود کو ہمیشہ حاشیہ پر رکھا اور اسی خلوص سے ادبا و شعرا کے لطیفے اکٹھا کر کے ایک بڑا کام انجام دیا اور خود ادیبوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔''

نند کشور وکرم، شاہد ماہلی، نذیر فتح پوری اور ڈاکٹر مشتاق صدف نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ آخر میں کتاب کے مؤلف نذیر فتح پوری اور نارنگ ساقی نے تمام مہمانانِ گرامی اور شرکائے محفل کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر انجم عثمانی، پروفیسر سید منظور احمد، پروفیسر عظیم اختر، نرمل سنگھ نرمل، ڈاکٹر عقیل احمد، ضیاء الرحمٰن غوثی، اقبال انصاری، معروف شاعر وقار مانوی، ظفر مرادآبادی اور ڈاکٹر رضا حیدر سمیت بڑی تعداد میں ادبی و شعری شخصیات موجود تھیں۔

◆◆◆

ایک دہشت گرد کا بیان

مراق مرزا (انڈیا)

اچانک فائرنگ کی آواز فضا میں گونجی اور اسلام پورہ مارکیٹ میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ علاقے کی چھوٹی بڑی سب دُکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ لوگ باگ ادھر ادھر بھاگتے دکھائی دینے لگے۔ دراصل اسلام پورہ مارکیٹ سے ملحق شیوا جی نگر ہے۔ جو ہندوؤں کی کثیر آبادی والی کالونی ہے۔ گولیاں چلنے کی آواز کے سبب لوگوں کو لگا شاید ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے اس لئے پوری مارکیٹ میں افراتفری مچ گئی۔

مگر ماجرا کچھ اور تھا۔ فائرنگ پولیس نے کی تھی۔ مارکیٹ کے ناکہ پر واقع محمودیہ لاج میں چھپے دو دہشت گردوں کے متعلق اطلاع ملنے کے بعد پولیس نے لاج پر چھاپا مارا تھا اور جب دہشت گردوں نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو پولیس والوں نے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ کراس فائرنگ کا سلسلہ ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ دہشت گرد بھاگنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک کو موقع واردات پر ہی مار ڈالا گیا دوسرا زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔

ہسپتال میں اگرچہ اس کے جسم سے گولیاں نکال دی گئی تھیں تاہم اس کی حالت نازک تھی اور بچنے کی امید بہت کم تھی۔ آپریشن کے دس گھنٹے بعد جب اسے ہوش آ گیا تو ڈاکٹروں نے قدرے اطمنان کی سانس لی۔ اب وہ خطرے سے باہر تھا۔ پولیس کے لئے بھی اس کا زندہ رہنا از حد ضروری تھا کہ اس دہشت گرد سے بہت سے راز معلوم ہو سکتے تھے۔ ملک کے خلاف دشمنوں کے منصوبوں کے بارے میں پتہ چل سکتا تھا۔

ضروری طبّی معائنے کے بعد جب ڈاکٹر مطمئن ہو گئے کہ یہ دہشت گرد بات چیت کر سکتا ہے تو انہوں نے انسپکٹر بلبیر سنگھ سے کہا کہ وہ اس کا بیان لے سکتے ہیں۔ بلبیر سنگھ نے ہی اپنی پولیس ٹیم کے ساتھ اسے گرفتار کیا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' بلبیر سنگھ نے سوال کیا۔ ڈاکٹر اور چند پولیس والے بھی دہشت گرد کے بیڈ کے آس پاس کھڑے تھے۔

''دہشت گرد!''.....دہشت گرد نے جواب دیا۔

''یہ تو تمہارا پیشہ ہے، اصلی نام بتاؤ!''

''اصلی نام تو اب ماضی کا حصہ ہے۔ جس سے میرا کوئی تعلّق نہیں۔ اب میری شناخت یہی ہے۔ دہشت گرد!''

''یہ میں بھی جانتا ہوں۔ مگر کیس تمہارے اصلی نام سے ہی رجسٹر ہوگا۔ نام بتاؤ''

''نور خان''۔

''پیشہ؟''

''دہشت گردی سے خوف و ہراس پھیلانا''

''معصوموں کا خون بہانے سے پہلے کیا کرتے تھے؟''

''طالب علم تھا۔ قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا جو پوری نہ ہو سکی''۔

''شہریت؟''

''پہلے ہندوستانی تھا۔ اب نہیں ہوں!''۔

''کیوں؟! اب کیا تمہارا رشتہ سرحد پار سے ہو گیا ہے؟!''

''نہیں۔ اب میرا رشتہ RDX اور AK.57 رائفلز سے ہو گیا ہے۔ اس لئے اب میں خود کو ہندوستانی نہیں کہتا۔ اب میں دہشت گرد ہوں۔۔ صرف دہشت گرد۔ جس کا نہ کوئی ملک ہوتا ہے نہ مذہب!!''

''جھوٹ بول رہے ہو تم!!۔ یہ سارا کھیل مذہب کے نام پر ہی تو کھیلا جا رہا ہے!!۔

''میرے مذہب میں دہشت گردی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ ایک منظّم سازش ہے میرے مذہب کے خلاف۔ مغربی طاقتیں یہ کھیل کھیل رہی ہیں۔ میرے عظیم مذہب کو بدنام کرنے کے لئے۔ میں جو کر رہا ہوں اس کا تعلّق مذہب سے نہیں ہے۔!؟''

''پھر یہ دہشت گردی کا راستہ کس لیے چنا تم نے؟''

''ملک کے اندر سفید پوش دہشت گردوں کی ایک جماعت ہے۔ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے۔ جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ زہر زہر کو مارتا ہے، اسی طرح ان سفید پوش دہشت گردوں سے اپنے ملک کو پاک کرنے کے لئے ہم نے دہشت گردی کا راستہ چنا ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ کیوں کہ کیچڑ صاف کرنے کے لئے کیچڑ میں اترنا ہی پڑتا ہے۔''

''سفید پوش دہشت گرد سے تمہارا مطلب کیا ہے؟!''

''وہ لوگ جو مذہب کے نام پر سیاست کرتے ہیں۔ انکی نظر میں ہر مسلمان، ملک کا غدار ہے۔ ان لوگوں نے گاندھی جی کو بھی نہیں بخشا تھا۔''

''ان لوگوں سے تمہارا کیا واسطہ؟''

''ان لوگوں سے میرا بہت ہی گہرا رشتہ ہے۔ انہی کی وجہ سے مجھے یہ نیا نام ملا ہے۔ دہشت گرد! انہوں نے ہی مجھے یہ راستہ دکھایا ہے۔!!

اس کی یہ بات سُن کر پولیس افسر خاموش رہا اور متفکرانہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ اس نے اپنا بیان جاری رکھا۔

''یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے Muslim Genocide کا منصوبہ بنا کر میرے شہر میں فرقہ وارانہ فساد کروایا تھا اور منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس مہم میں پولیس اور صوبہ کی سرکار بھی انکے ساتھ تھی۔ مسلمانوں کی بستیوں اور کالونیوں کو چن چن کر نیست و نابود کیا جا رہا تھا۔ کئی مقام پر بچوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ عورتوں کی آبرو لوٹنے کے بعد انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دہشت گردی کی انتہا تو یہ تھی کہ ایک حاملہ عورت کا پیٹ پھاڑ کر اس کے اندر سے بچہ نکال کر اس بچہ کو ترشول کی نوک پر بلند کر کے حیوانیت کی مثال پیش کی گئی تھی۔ اور پولیس تماشائی بنی ہوئی دہشت گردی کا یہ ننگا ناچ دیکھ رہی تھی۔''

انسپکٹر بلبیر خود سکھ تھا۔ نور خان کی باتیں سن کر ماضی میں کھو گیا اور سن چوراسی میں مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جو سکھ ہندو فساد ہوا تھا اس کا ہولناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ وہ فساد بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا جس کی بات نور خان کر رہا تھا۔ Sikh Genocide

پھر اسے یاد آیا کہ اس کے پتا نے جان بچانے کے لئے اس کے اور اپنے لمبے بال اور داڑھی کٹوا دی تھی۔ یعنی اپنی پہچان بدل لی تھی۔ سکھ ہونے کا ثبوت مٹا دیا تھا۔ کتنا بھیانک تھا وہ دنگا۔ اسے اپنے چاچا اور چاچے کی فیملی کے مارے جانے کی بات بھی یاد آ گئی۔ فسادیوں نے اس کے چاچا اور ان کے گھر کے سبھی افراد کو جانوروں کی طرح گھر سے باہر گھسیٹ کر سرعام انکی ہتیا کی تھی۔ پانچ سال کے سونو تک کو نہیں چھوڑا تھا۔ اور تب بھی پولیس تماشا دیکھ رہی تھی۔

فساد تھمنے کے بعد جب وہ کالج گیا تھا تو اس کے دوست اسے پہچان نہیں پائے تھے کیوں کہ سر پر پگڑی نہیں تھی، اسے دوستوں کو بتانا پڑا تھا کہ وہ بلبیر سنگھ ہے۔ کئی دوستوں نے اس کا مذاق بھی اڑایا تھا۔ طنزیہ انداز میں کہا تھا ''اچھا ہوا وہ سکھ سے ہندو بن گیا ہے۔'' اب تو کوئی سکھوں پر بنے جوک (Joke) سنا کر اس کی ہنسی نہیں اڑائے گا۔ تب اس کے دل کو شدید چوٹ پہنچی تھی۔

اس فساد کے بعد ہی پنجاب میں دہشت گردوں کی ایک بہت بڑی فصل پیدا ہوئی تھی۔ اور اخباروں میں سکھوں کے ساتھ کیے جانے والے مظالم کے بارے میں پڑھ کر ایک بار اس کا بھی دماغ گھوم گیا تھا اور ایک پل کے لئے اس نے سوچا تھا کہ گھر سے بھاگ کر ہتھیار اٹھا لے اور ان لوگوں کے خلاف جنگ شروع کر دے جنہوں نے اس کی قوم پر ظلم ڈھائے تھے۔

ایک ہی پل میں سن چوراسی کے بے شمار خوفناک منظر اس کے ذہن کے پردے پر ابھرے اور مٹ گئے۔ پھر اس نے نور خان کی طرف توجہ مرکوز کی جس کا بیان ابھی ادھورا تھا۔ سانس لینے میں اسے کچھ تکلیف محسوس ہوئی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اور دیگر پولیس کے اہلکار قدرے فکرمند نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دوسرے ہی پل وہ بولا۔ ''ان لوگوں کی دہشت گردی کا قہر میرے خاندان پر بھی ٹوٹا تھا۔ میرے والد، بڑے بھائی اور چھ سالہ بھتیجہ ریحان۔ سبھی کو میرے سامنے زندہ جلایا گیا

تھا۔میری جوان بہن اور بھابھی کی پہلے عصمت دری کی گئی تھی اور بعد میں انھیں میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا تھا۔پھر پولیس آئی تھی اور پولیس نے ان دہشت گردوں کے بجائے مجھے گرفتار کرلیا تھا۔چونکہ میرے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہوسکا لہٰذا میں بعد میں رہا ہوگیا۔مگر اب میری زندگی میں کچھ بچا نہ تھا۔سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔اس سانحے کے بعد میرا خدا سے بھی یقین اٹھ گیا تھا۔ میں نے مسجد جانا چھوڑ دیا تھا۔میرے اندر کا انسان پوری طرح مرگیا۔پھر ہتھیار پکڑانے والی طاقتیں مجھے مل گئیں اور میں وحشی بن گیا۔۔اب میں نہ انسان ہوں نہ مسلمان۔۔اب میں دہشت گرد ہوں،صرف دہشت گرد!!''

انسپکٹر بلبیر اور اس کے اردگرد کھڑے افراد پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔نور خان عرف دہشت گرد Confession میں اپنا بیان دے رہا تھا۔''آتنکوادی ماں کے پیٹ سے ہاتھ میں AK-57 رائفل کے ساتھ پیدا نہیں ہوتے۔ظلم اور بے انصافی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے آتنکواد۔۔یہ خیال غلط ہے کہ دہشت گردی کے تار سرحد پار سے جڑے ہوئے ہیں۔دہشت گرد پیدا کرنے کی مشین تو ملک کے اندر ہے۔مندر مسجد کے نام پر سیاست کی دوکان چلانے والی فاشٹ طاقتوں کے سبب ہی پیدا ہورہے ہیں دہشت گرد۔جب کسی شہر یا صوبہ کو کسی مخصوص قوم کی نسل کشی کے لیے لیب Lab کی طرح استعمال کیا جائے گا تب ملک میں دہشت گردوں اور مجاہدوں کی ایک بڑی فصل پیدا ہوگی۔اگر ملک کو تشدد کے شعلوں سے بچانا ہے تو پہلے ان سفید پوش دہشت گردوں کو اس دھرتی سے مٹانا ہوگا ورنہ وہ دن دور نہیں کہ پورا ملک Civil War کی آگ میں جھلستا ہوا نظر آئے گا۔''

اچانک ایک شدید ہچکی کے ساتھ نور خان کی سانس تھم گئی اور اس کا جسم ساکت و جامد ہوگیا۔انسپکٹر بلبیر سنگھ اپنے اندر ایک عجیب سی کیفیت محسوس کررہا تھا۔اس کے سامنے ایک دہشت گرد کی لاش تھی۔یہ دہشت گرد تو مرچکا تھا مگر اس کے ساتھ اس کی سوچ نہیں مری تھی۔اس کی یہ سوچ فرقہ پرست طاقتوں کے ظلم و جبر کا شکار ہوجانے والے بے شمار نوجوانوں کے اندر زندہ تھی۔ انسپکٹر بلبیر کا ذہن بری طرح الجھتا جارہا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سوچ کو کس طرح مارا جائے کیوں کہ اس سوچ کے خاتمے کے بغیر دہشت گردی کا خاتمہ ناممکن تھا۔پھر اس نے سوچا.....پھر اس نے سوچا.....پھر اس نے سوچا.....

لیکن ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

اِن اشکوں کے سیلاب سے بھی تقدیر کا لکھا دُھلتا نہیں
کیا ہوتا ہے، کیوں ہوتا ہے، یہ بھید کسی پر کھلتا نہیں

بڑی مشکل ہے پنگھٹ کی ڈگر

زہیرہ سمن علی (بلغراد)

''لالی''

ماں کی تیز آواز نے اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ کتنی دیر سے وہ چادر پر پھول کاڑھتی ہوئی نجانے کہاں محو ہو گئی تھی اور اس کو لگ رہا تھا کہ نہ سوئی اس کے اختیار میں تھی اور نہ اپنے ہاتھوں کی حرکت۔ نجانے سوئی گر رہی تھی اور گر کر اٹھ رہی تھی، کہیں سے اک اک کر کے کپڑے پر پھول اور پتیاں کھلتی جا رہی تھیں، پھول ابھر رہے تھے، اس کی انگلیوں تلے ایک باغ کھلتا جا رہا تھا۔ سوئی دھاگے اور اس کی انگلیوں کی حرکت خود اس کے لیے نا قابلِ مفہوم ہو چکی تھی۔ یہ بھی کیا تھا ٹانکوں کا لگتے جانا، اس کی توجہ ان نقوش پر مرکوز نہیں تھی جو وہ بنا رہی تھی بلکہ وہ تو ان ٹانکوں کو دیکھ رہی تھی جو سانسوں کی طرح نجانے کہاں سے اُبھر رہے تھے۔

جب وہ چھوٹی تھی تو سکول میں تختی لکھتے ہوئے بھی تو اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا تھا، قلم کی نوک سے روشنائی کے حروف میں بدل جانے کا منظر اس کے لیے الفاظ سے زیادہ دلچسپ ہو جاتا تھا۔ اسی لیے تو شاید وہ آٹھویں سے آگے نہیں جا سکی تھی۔ یوں بھی بڑا سکول گاؤں سے دور تھا۔ اور جب ماسٹر عبداللہ نے غصے سے اس کے باپ کو کہا ''کہ نکمّی ہے اور بیٹھی بیٹھی نجانے کن سوچوں میں گم ہو جاتی ہے'' تو باپ نے اس کو سکول سے اٹھا لیا۔ یوں بھی اس کو پڑھا کر کسی کو کیا مل جانا تھا۔ انہوں نے اس کی شادی طے کر دی۔

''سارا دن بیٹھی اپنے جوڑے ہی ٹانکتی رہے گی کہ پانی بھی لائے گی۔'' ماں نے کہا۔ ماں سارا دن غصے میں بھری پھرتی رہتی تھی۔ بیچاری کو کام بھی تو بہت کرنا پڑتا تھا، لالی نے سوچا۔ دیواروں پر لیپ کرنا، بکریوں کو چارا ڈالنا، ہانڈی روٹی کرنا، ابا پھر مزدوری کی تلاش میں نجانے کہاں جا چکا تھا۔ لالی نے ماں کو دیکھا جو آنگن میں بیٹھی چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔ اس کے گرد دھوئیں کا چھوٹا سا ملگجا بادل چھایا ہوا تھا۔ لالی نے آہستہ سے چادر اور سوئی دھاگہ ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ عرصے سے وہ اپنا جہیز تیار کر رہی تھی۔

اس کو کڑھائی کرنا اچھا لگتا تھا۔ کڑھائی کرتے ہوئے اس کو لگتا تھا کہ وہ کسی اور جگہ پہنچ گئی ہے جس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں جو اس کے اردگرد آباد ہے۔ وہ کیسی جگہ تھی جو نہ ہونے اور ہو جانے کے مقام پر آباد تھی۔ جہاں دھاگہ ٹانکے میں بدل جاتا تھا، ٹانکے پھول پتیوں میں بدل جاتے تھے، خالی چادر پر رنگ برنگا باغ کھل جاتا تھا۔

لالی کو کڑھائی میں مصروف دیکھ کر ہر کوئی سوچتا تھا کہ وہ یقیناً اپنے ہونے والے شوہر کے خوابوں میں کھو جاتی ہے۔ آرزوؤں، ارمانوں اور محبت بھرے خوابوں کے کسی دیس میں پہنچ جاتی ہے مگر ان کو علم نہیں تھا کہ لالی نے تو آج تک اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ لالی کے لیے تو اس کا ہونے والا بیاہ بس اسی طرح تھا جیسے صحرا کی ریت، کیکر کے درخت، جھونپڑی کی کچی دیواریں اور وہ بیکراں آسمان جسکے نیچے وہ رہتی تھی۔ ایک ایسی حقیقت جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی مگر جس سے انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔

''جا، پانی لے آ'' ماں نے لکڑیوں میں پھونکیں مارتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے اور آنسو تیر رہے تھے۔ ماں کبھی دھوئیں کی ماری روتی تھی اور کبھی باپ کے ستم سے۔ جب باپ دارو پی کر آتا تھا تو بلاوجہ ہی اس پر پل پڑتا تھا۔ اور ماں سوچتی تھی کہ اگر اُس کا کوئی بیٹا ہوتا تو شاید وہ اس کے ساتھ بہتر سلوک کرتا۔ مگر لالی کے بعد تو جیسے اس کی کوکھ ہی سوکھ گئی تھی، تھر کی طرح جو بارش کو ترستا رہتا تھا۔ پیاسا رہتا تھا۔

لالی نے مٹکی سر پر رکھی اور پنگھٹ کی طرف چل دی۔ لمبا راستہ تھا۔ مگر لالی کو یہ کٹھن ڈگر اچھی لگتی تھی نجانے کیوں۔ مٹکی سر پر جما کر وہ چلتی تھی تو ریت پر اپنے قدموں کے سفر میں گم ہو جاتی تھی۔ ریت کے ذرّوں کو گننا ناممکن تھا اور بعض دفعہ وہ اپنے قدموں کو گننے کی کوشش کرتی تو اس کو لگتا کہ یہ بھی ممکن نہیں۔ شاید ایک قدم اور ایک ہزار قدموں میں کوئی فرق نہیں تھا، صحرا کا سفر تو ایسا ہی تھا اور وہ یہ سفر ہر روز کرتی تھی۔

جب لالی نے مٹکی کو لبالب پانی سے بھر لیا تو سر پر جما کر واپس چل پڑی ابھی کچھ دور ہی پہنچی تھی کہ اس کے سامنے ایک شتر سوار نمودار ہوا۔ اس کا اجلا لباس چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور اس کا چہرہ نیلی چادر کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اونٹ کے گلے میں بندھی گھنٹیاں یوں بج رہی تھیں جیسے صحرا کی خاموشی کو بیان کر رہی ہوں۔

لالی کے قدم رُک گئے۔ اونٹ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہر طرف مشک اور گلاب کی ہلکی سی مہک پھیل گئی۔ شتر سوار نے چادر چہرے سے ہٹائی اور لالی نے دیکھا وہ چہرہ سورج کی طرح تابناک تھا، وہ آنکھیں روشن رات جیسی تھیں۔

کیسا چہرہ تھا یہ جس کے حُسن کی تاب لانا مشکل تھا۔

وہ پیاسا تھا اور پانی کے چند گھونٹوں کا طلب گار تھا۔ اس نے ہاتھوں کو پیالے کی مانند اس کے سامنے بڑھا دیا۔ لالی کو لگا اس کی قوّتِ گویائی سلب ہو گئی ہے اور اس کی آنکھیں بینائی سے محروم ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ایک چہرے کی دید دل کی حالت کو بدل دے۔ بے شمار مرتبہ وہ اس راستے سے گزری تھی مگر آج تک اس کے ساتھ ایسا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ پانی کی دھار ہاتھوں کے پیالے میں بہنے لگی۔ پھر ان کی نظریں ملیں اور لالی کے ہاتھ سے مٹکی چھوٹ گئی۔ اس دن کے بعد سے گاؤں والوں نے لالی کو پھر کبھی نہ دیکھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا پنگھٹ کی ڈگر پر کیا ہوا تھا ان کو تو صرف ٹوٹی ہوئی مٹکی کے ٹکڑے ملے تھے۔

◆◆◆

جذبۂ عشق

نجیب عمر

خاندان کے سارے لوگ وکیل صاحب کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ وہ دادا جان کی وصیت تفصیل سے پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ جائیداد کے حصے نجرے میں میرے والد سمیت میرے جس تایا، چچا یا پھوپھی کا نام آتا میں ان کے چہروں کے بدلتے رنگ صاف دیکھ رہا ہوں۔ دادا جان نے کافی حد تک مساوی تقسیم کی تھی لیکن ہمارے سب سے چھوٹے چچا، جو خاندان کے ہیرو سمجھے جاتے تھے اور میرے بھی آئیڈیل تھے، ان کا حصہ خاصا تھا۔ چونکہ انہوں نے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنا تھی اور شادی بیاہ بھی باقی تھا۔ اسی طرح میری سب سے چھوٹی پھوپھی جو میڈیکل کے آخری سال میں تھی، ان کا ذکر بھی وصیّت میں نمایاں تھا۔ لہٰذا عام طور سے کسی کو شکایت نہیں تھی اور سب اپنی اپنی جگہ مطمئن بیٹھے تھے۔ وکیل صاحب بھی برسوں سے خاندان کے قانونی مشیر تھے اور بھروسے کے قابل بھی تھے۔ اس لیے امید کی جارہی تھی کہ یہ مرحلہ بخیر وخوبی طے پا جائے گا۔

وکیل صاحب فرمارہے تھے کہ ''مرزا دادا صاحب نے ساری زندگی بڑی محنت کی۔ وہ ایک دیانتدار، کھرے اور سچے آدمی تھے۔ میرا تو تیس برس کا ساتھ تھا اور وہ بھی مجھے فیملی ممبر کا درجہ دیتے تھے اور میں بھی ان کی قدر کرتا تھا۔ آج وہ دنیا میں نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی جائیداد اور دولت میں جو حصّہ آپ کو مل رہا ہے، ان کے احسان کو تسلیم کریں اور ان کی قدر کریں۔ انہوں نے زندگی میں اپنی ذات پر کبھی زیادہ خرچ نہیں کیا اور ایک متوسط زندگی گزاری۔ تاہم کاروبار میں ان کی دیانت اور ایمانداری سے بڑی برکت ہوئی۔ محنت سے انہوں نے اپنی ساکھ قائم کی۔ وہ کروڑوں کا لین دین زبانی کر لیتے تھے۔ مارکیٹ میں ان کی زبان کا بھرم قائم تھا۔ ساری زندگی اپنے کاروباری دوستوں کا ساتھ دیا اور ان کے کام آئے۔ آج وہ سارے لوگ ان کے لیے اداس ہیں۔ ہم سب کو بھی ان کی جدائی کا غم ہے۔ آپ ان کی اولاد ہیں۔ زندگی ساتھ گزاری ہے۔ آپ کی یادوں میں وہ پوری توانائی کے ساتھ آباد ہوں گے۔ اگر آپ میں سے کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے، تو یہ ایک مناسب موقع ہے۔ نہ جانے ہم پھر اس طرح اکٹھے ہوسکیں گے یا نہیں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس ملاقات کو یادگار بنایا جائے۔''

میرے بڑے تایا مرزا ہمایوں نے آغاز کیا۔ ''میں نے والد کے ساتھ سب سے زیادہ عرصہ گزارا ہے۔ میں انہیں ایک مہربان دوست سمجھتا ہوں۔ انہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، ان کی وجہ سے ہوں۔ انہوں نے

مجھے کاروبار کے بنیادی اصول سکھائے کہ دیانتداری وہ کنجی ہے جس سے خزانے کا در کھولا جا سکتا ہے۔ دو نمبر طریقے سے وقتی فائدہ ہوسکتا ہے لیکن نقصان بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ اگر ساکھ ختم ہو جائے تو پھر کاروبار میں کیا رہ جاتا ہے۔ میں نے ان کی نصیحتوں کو گرہ میں باندھ لیا اور مجھے کبھی پچھتانا نہیں پڑا۔''

چھوٹے تایا مرزا مراد کہنے لگے۔ ''تعلیم مکمّل کرنے کے بعد میں کوئی اچھی سی ملازمت کرنا چاہتا تھا چونکہ خاندان میں سب ہی کاروبار کرتے تھے لہٰذا میرے دل میں ملازمت کا ایک رومانس تھا۔ لیکن والد نے میری رہنمائی کی اور یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا کہ کسی کا نوکر بننے سے بہتر ہے کہ تم خود لوگوں کو ملازم رکھنے کے قابل بن جاؤ اور مجھے کاروبار کی راہ دکھائی۔ آج میں خوش اور مطمئن ہوں اور ایک کامیاب بزنس مین ہوں۔''

ان کے بعد میرے والد مرزا شکوہ کی جانب سب کی نگاہیں مرکوز تھیں میں جانتا تھا کہ وہ دادا جان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے لیے اپنے والد کو یاد کر کے کچھ بولنا خاصا مشکل ہوگا۔ بہرحال انہوں نے کہا۔ ''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی انسان کے کامیاب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی دشمن اور برا چاہنے والا نہ ہو بلکہ سب اس کی محبت میں گرفتار ہوں۔ ہم تو ان کی اولاد ہیں۔ ان کے کارندے اور گھریلو ملازم تک ان سے محبت کرتے تھے۔ ہمیں بھی ان کی راہ اپنانی چاہیے۔ جائیداد کے حصّے بخرے تو ایک ثانوی چیز ہے، اگر والد مجھے کچھ بھی نہ دیتے تو بھی میں ان کے لیے دعائے خیر کرتا۔

ان کے آخری جملے نے مجھے خوش کر دیا۔ بڑے چچا مرزا شجاع نے کہا۔ ''مائی فادر واز اے گریٹ مین۔ وہ اپنی رائے کسی پر ٹھونستے نہیں تھے وہ لوگوں کو ہم خیال بنانے کا فن جانتے تھے۔ اختلاف کا کبھی برا نہیں مناتے تھے۔ میں نے اکثر ان سے اختلاف کیا۔ انہوں نے اسے اہمیت دی اور گاہے میری رائے کو تسلیم بھی کیا۔ وہ کہیں اور مکان بنانا چاہتے تھے۔ میں نے مخالفت کی اور انہیں قائل کیا کہ کوئی پرفضا مقام آپ کی رہائش کے لیے مناسب رہے گا۔ پھر میری تجویز پر یہ جگہ پسند فرمائی۔ انہوں نے ہم سب کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی جس کا نتیجہ ہے کہ ان کی اولاد آج کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔''

اب میرے سب سے چھوٹے چچا مرزا دارا کی باری تھی۔ وہ ایک طویل خاموشی کے بعد گویا ہوئے ''میں ابھی تک خود کو باور نہیں کرا سکا کہ والد ہمیں چھوڑ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کہیں سے نکل کر ہمارے سامنے آ جائیں گے۔ لیکن موت بہرحال ایک حقیقت ہے اور ہم سب کو اس کا سامنا کرنا ہے۔ میرے والد کوئی کٹّر مذہبی آدمی نہیں تھے لیکن دین کے اصولوں پر عمل پیرا تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ کہ انہوں نے ہماری بہنوں کو بھی وراثت میں شریک کیا۔ وہ صنف نازک کا بڑا احترام کرتے تھے۔ میری والدہ کی رحلت کے بعد انہوں نے کبھی دوسری شادی کا خیال دل میں نہیں آنے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ شخص غیر مہذب ہے جس کے دل میں عورت کی توقیر نہ ہو۔ ان کی تربیت کا طریقہ بڑا نرالا تھا۔ وہ اپنی کسی اولاد کی منہ پر تعریف نہیں کرتے بلکہ دوسرے بہن بھائیوں کی خوبیاں ہمارے سامنے گنواتے۔ اس طرح ہم بہن بھائیوں میں محبت کا رشتہ استوار ہے۔''

''وکیل صاحب آپ اطمینان رکھیں ہم میں سے کسی کی جانب سے ہرگز کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ہم ان کے فیصلے کے

آ گے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔''

اب میری بڑی پھوپھی جمیلہ، جن کا بھائی بہنوں میں تیسرا نمبر ہے، بولیں۔''وی آر لکی ٹو ہیو سچ اے فادر۔ایک دنیا ان کو چاہنے والی تھی۔وہ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔وہ سخی، ہمدرد اور غم گسار تھے۔انہوں نے ساری زندگی دوسروں کی مدد کی۔ وکیل صاحب بتا رہے تھے کہ انہوں نے گھریلو ملازموں کے لیے بھی رقم مختص کی ہے۔وہ ایک سچے اور کھرے آدمی تھے۔جھوٹ سے انہیں نفرت تھی۔ایک مرتبہ میں نے جھوٹ بولا اور پکڑی گئی۔انہوں نے پیار سے سمجھایا''جب انسان جھوٹ بولتا ہے وہ خدا کے وجود کا منکر ہوتا ہے چونکہ خدا جانتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن پھر بھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا ہے۔سچ کو اپناؤ اس میں عافیت ہے۔''

میری چھوٹی پھوپھی شکیلہ جن کا نمبر ساتواں ہے اور خاندان میں سب سے چھوٹی ہیں، کافی دیر سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔دراصل ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔گلوگرفتہ انہوں نے کہا''یہ تسلیم کرنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی ہے کہ میرے والد اب اس دنیا میں نہیں۔میں تو انہیں اپنے آس پاس محسوس کر رہی ہوں۔میں اس لیے بھی فکرمند ہوں کے والدہ کے بعد وہ میری ہر مشکل کا حل تھے۔اب ضرورت پڑی تو میں کہاں جاؤں گی''اور وہ زاروقطار رونے لگیں۔

وکیل صاحب نے کہا۔''آپ لوگوں کے خیالات سن کر مجھ بے حد خوشی ہوئی۔اب ایک مرحلہ باقی ہے اگر آپ مناسب جانیں تو اس کا فیصلہ بھی ابھی کر لیتے ہیں۔''

سب سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

وکیل صاحب نے وضاحت کی۔''آپ کے والد کے پاس زیور کا ایک منقش ڈبہ تھا۔جس میں کچھ قیمتی اور نایاب چیزیں ہیں۔اس کی تفصیل انہوں نے نہیں بتائی۔صرف یہ چابی دی جس سے وہ ڈبہ کھل جائے گا۔اس کے اندر ایک اور ڈبہ ہے اور اس کے اوپر ایک لفافہ جس میں ہدایات درج ہیں کہ وہ ڈبہ کیسے کھلے گا؟اس کے اندر کیا ہے؟اور اسے کیسے تقسیم کرنا ہے۔آپ سب اس ڈبے سے ضرور واقف ہوں گے اور والد کے پاس دیکھا ہوگا۔آپ میں سے کوئی ان کے بیڈروم سے جا کر لے آئے۔''

میری دونوں پھوپیاں اور چاچیاں اندر لپکیں اور ہم سب انتظار کرنے لگے۔دادا جان نے اچھا خاصا سسپنس پیدا کر دیا تھا۔آنکھیں دروازے پر مرکوز تھیں۔

کافی انتظار کے بعد بھی جب خواتین واپس نہیں آئیں تو سب زیرِلب بڑبڑانے لگے۔میرے چھوٹے چچا ان کو دیکھنے اندر گئے۔پھر وہی انتظار اور اس کے بعد سارے لوگ خالی ہاتھ لوٹے تو چہ مے گوئیاں شروع ہو گئیں۔

''بھئی زیور کا وہ ڈبہ نہیں مل رہا۔اب سارے گھر میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے''چھوٹے چچا بولے

بڑی پھوپھی نے اظہارِ خیال کیا۔''والد اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اسے والد کی اسٹڈی اور بیڈروم ہی میں ہونا چاہیے۔''

اب وکیل صاحب بولے ''بہرحال میں دوروز بعد پھر آؤں گا۔اس دوران میں اسے تلاش کرلیا جائے۔آپ لوگوں کو دوبارہ تکلیف کرنا پڑے گی چونکہ وہ ڈبہ آپ سبھی کی موجودگی ہی میں کھولا جائے گا۔اس کے بعد ہی ہم جان سکیں گے کہ مرزا داود صاحب کی کیا منشا ہے اور اس ڈبے میں موجود چیزوں کے حقدار کون کون ہوں گے؟''

وکیل صاحب کے جانے کے بعد آپس میں تکرار شروع ہوگئی۔تھوڑی دیر قبل جو ملّمع میرے بزرگوں نے اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا۔وہ تیزی سے اترنے لگا۔ہر شخص دوسروں پر شک کرنے لگا۔اور یہ جاننے کے بعد کہ اس میں قیمتی نوادرات ہیں، کوئی بھی اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔بڑی پھوپھی جمیلہ نے چھوٹی پھوپھی شکیلہ پر الزام لگادیا کہ ''تم مستقل اس گھر میں رہتی ہو۔تمہیں ضرور معلوم ہوگا وہ زیور کا ڈبہ کہاں ہے۔''

چھوٹی پھوپھی نے بھی تمام تر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کہہ دیا'' مجھے زیوروں کا کوئی شوق نہیں۔میں والد کی وصیت سے بہت مطمئن ہوں، مجھے مزید کسی چیز کا لالچ نہیں۔''

مرزا ہمایوں، بڑے تایا بولے۔''وہ ڈبہ ہم میں سے کسی کے پاس ہی ہے،اب وہ بتانا نہ چاہے تو اور بات۔''

مرزا مراد کہنے لگے ''بھائی صاحب آپ کھل کر بات کریں۔آپ کو کس پر شک ہے۔''

میں سوچنے لگا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل ہر فرد اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کررہا تھا اور اس چھوٹے سے تنازعے نے سب کو کھال سے باہر نکال دیا ہے۔

چھوٹے چچا دارا نے کہا۔گھر کے ملازم سب معتبر ہیں وہ ایسی حرکت نہیں کرسکتے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ڈبہ ہم میں سے کسی کے پاس ہے۔لیکن اسے تنہا کوئی ہضم نہیں کرسکتا۔میرے لیے زیادہ اہمیّت والد کی اس وصیت کی ہے کہ جو اسی ڈبے میں بند ہے کہ آخر وہ کیا چاہتے تھے اور یہ عقدہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا جب تک وہ ڈبہ مل نہیں جاتا۔چابی وکیل صاحب کے پاس ہے جس کے بغیر کھولا نہیں جاسکتا۔''

میرے والد بولے ''جو ڈبہ غائب کرسکتا ہے وہ اسے کھولنے کے لیے چابی کا محتاج نہیں۔لیکن یہ کتنی غلط بات ہے کہ والد نے ہم سبھوں کو اتنا کچھ دیا،اس کے باوجود اگر ہم میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہے تو افسوس کی بات ہے۔''

بڑے چچا مرزا شجاع نے کہا۔''اگر زیور کا ڈبہ دریافت نہیں ہوا تو پولیس کی بھی مدد لی جاسکتی ہے۔''

''اب کیا گھر کے معاملات تھانے کچہری میں طے ہوں گے اس سے تو بڑی سبکی ہوگی۔'' چھوٹے چچا نے اضافہ کیا۔

اِس میٹنگ کے اختتام پر ہر شخص اس زیور کے ڈبے کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔اس کے غائب ہونے نے اس میں اور اضافہ کردیا۔

ایک ہفتے بعد وکیل صاحب نے دوبارہ سب کو اکٹھا کیا۔گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے کہا اس وقت یہاں کمرے میں وہ شخص موجود ہے جس کے پاس ڈبہ ہے۔لیکن میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔اگر وہ خود اقرار کرلے تو اسے کچھ نہیں کہا

جائے گا۔ دوسری صورت میں اسے اس ڈبے کے حصے سے بھی محروم کیا جا سکتا ہے۔''

بڑے تایا مرزا ہمایوں نے فوراً دریافت کیا ''وہ کیوں کر؟''

وکیل صاحب نے جواب دیا۔'' یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ وصیّت پر قابل اطمینان طریقے سے عمل ہوا۔ لیکن لالچ بری بلا ہے اور کسی نے پورا ڈبہ ہتھیانے کا فیصلہ کیا۔ جسے کسی بھی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کے اسے کچھ موقع اور دیا جائے اس کے بعد قانون کا سہارا لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ آئندہ دو ہفتے بعد ہم دوبارہ اکٹھا ہوں گے۔''

دو ہفتے کے بعد پھر سب جمع ہوئے لیکن حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ چھوٹے چچا دارا کھڑے ہوئے اور وکیل صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''وکیل صاحب۔ چور آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے''

''میں تو پہلے ہی بتا چکا ہوں''

''لیکن وہ خاندان کا فرد نہیں ہے''

''کیا مطلب؟''

''جی ہاں میں صحیح کہہ رہا ہوں''

''یعنی آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ یہ کیا لغو بات ہے۔'' وکیل صاحب چیخے۔

چچا نے کسی کو آواز دی۔ اور ایک دوشیزہ ہال میں داخل ہوئی۔ سب اسے دیکھنے لگے۔

''وکیل صاحب۔ آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''یہ میری بیٹی سنبل ہے''

''لیکن یہ آپ کی طرح خائن نہیں۔ اس نے حق کا ساتھ دیا اور اپنے باپ کے خلاف گواہی دینے کے لیے راضی ہوگئی۔ میں اس کی اس جرأت کو سلام پیش کرتا ہوں''

وکیل صاب چیں بہ چیں سر جھکا کر خاموش ہو گئے

چچا گویا ہوئے ''ہم دو سال سے یونیورسٹی میں ہم جماعت ہیں۔ جب میں نے زیور کے ڈبّے کا حصہ اسے سنایا تو انکشاف ہوا کہ سنبل، وکیل اعزاز منشا کی بیٹی ہے اور یہ اپنے والد کو اس حرکت سے باز رکھنا چاہتی تھی۔ سنبل کی وجہ سے ایک انکشاف اور ہوا کہ والد صاحب نے سکھر میں لب مہران ایک کھجور کا باغ خریدا تھا۔ جسے انہوں نے ناجائز طریقے سے اپنے نام کرا لیا ہے اور ایسے کاغذات تیار کروا لیے جیسے والد صاحب نے انہیں فروخت کیا ہو۔ وکیل صاحب۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

وکیل صاحب نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور کہا: اب میرے لیے کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں''

کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ ہر شخص سوچوں میں گم تھا۔
بڑے تایا مرزا ہمایوں نے کہا۔ ''والد صاحب آپ پر اعتماد کرتے تھے۔ یہ آپ نے کیا کیا؟
میرے والد نے پوچھا۔ ''زیور کا ڈبہ کہاں ہے؟ اور اس میں کیا ہے''
چھوٹے چچا نے کہا ''وہ میں بتائے بلکہ دکھائے دیتا ہوں اور والد صاحب کا خط بھی پڑھ کر سنائے دیتا ہوں۔''
''میرے بچو! جو کچھ میرے پاس تھا وہ سب میں تم لوگوں میں تقسیم کر چکا ہوں۔ اعزاز صاحب کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ میری وصیت پر من وعن عمل ہوگا۔ یہ ڈبہ 786 سے کھلے گا۔ اس میں طلائی کنگن کا ایک جوڑا ہے جو چار پشتوں سے منتقل ہوتا مجھ تک آیا اور اب یہ ہمایوں کے پاس رہے گا کہ وہ خاندان کی پہلی اولاد ہے۔ اس کے اسی طرح آئندہ نسلوں تک جائے۔ اس کنگن کی قیمت اس کا سونا یا اس میں جڑے ہیرے جواہرات نہیں بلکہ نسلوں میں منتقل ہونے والی امانت ہے۔''
میرے والد مرزا شجاع نے اعلان کیا کہ سنبل قابلِ تحسین ہے اور اسے انعام ملنا چاہیے۔ میں نے دارا اور اس کی آنکھوں میں پیار کی کرن اور محبت کی چمک محسوس کی ہے لہٰذا ہمارے پورے خاندان کو سنبل کو بیگم دارا بنانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
سب نے پرزور تائید کی اور دونوں پھوپیوں نے سنبل کے سر پر ڈوپٹہ رکھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔
وکیل اعزاز منشا شرمسار کھڑے تھے۔ مرزا خاندان سے رشتہ داری ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

عمر اب میری ختم ہونے لگی
اور تم ہو خیال کرتی نہیں
کوئی چاہت کی بات ہوتی نہیں
میرے دامن میں پیار بھرتی نہیں

پانی پر لکھی نصیحت

دردانہ نوشین خان

''یہ کیسا شور ہے؟''

آراستہ پیراستہ محل کی بالائی بارہ دری میں چہل قدمی کرتے، ریشم و دیباج پوش بادشاہ کے مغرور و مسرور قدم ٹھٹھکے، غلام اور کنیزیں گھبرا گئیں، خدا نہ کرے فکر مندی کے بادل تاباں شاہی جبیں کو گہنائیں، مورچھل کا ارتعاش بڑھا، گلاب و یاسمن سے فضائیں معطّر کی گئیں، کچھ اور قندیلیں روشن کی گئیں، کچھ ساز بجنے لگے مگر منحوس شور نے سمع خراشی جاری رکھی۔ بادشاہ نے مضطرب ہو کے انگلی کو حرکت دی، عقابی نظر مستعد دربان لپک کر کورنش بجالایا، حکم ہوا۔

''وزیر مملکت کو حاضر کیا جائے''

دربان الٹے قدموں گیا اور آیا۔ وزیر مملکت بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے سختی سے پوچھا

''شور کیوں ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟''

وزیر مملکت نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

''شاہ معظم! شمالی علاقے میں گذشتہ شب زلزلہ آیا ہے۔ بچارے زلزلے کے مارے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں''

''ہماری خدمت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں؟ آسمانی آفتوں میں ہمارا دوش ہے کیا؟''

''بادشاہ سلامت! یہ بچارے دُکھی ہیں۔ آفت زدہ ہیں۔ آپ کی رعایا ہیں.....'' ابھی تمہید مکمّل نہ ہوئی تھی کہ بادشاہ نے حکم جاری کیا۔

''ریاست کی مساجد میں دکھی دعایا کے لئے دعا کا اعلان کیا جائے''

''م.....م.....مگر'' وزیر بے تدبیر ہچکچایا۔

''مگر.....؟ یہ نیا لفظ ہمارے دربار میں کہاں سے آیا؟''

''عالم پناہ.....جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں.....''

عالم پناہ نے اشارۂ ابرو سے جان کی امان دی، وزیر عرض گذار ہوا۔

''بھونچال نے عمارات، مکانات، مدارس گرا دیے۔ بہت سے لوگ ملبہ تلے دب گئے۔ ان کی جانیں بچانے کے لئے فوری امداد کی ضرورت ہے۔ بے گھر لوگوں کے لئے سائبان، خوراک، لباس، ادویات مطلوب ہیں''

''ہم نے تمہیں فرزانگی سکھا دی، تم نے درست کہا، سامان مہیّا کیا جاوے''

زلزلہ زدگان کے لئے خیموں کا شہر آباد کر دیا گیا، امدادی قافلے پہنچنے لگے، ملکوں ملکوں سے کرنسی کے تھیلے آنے لگے، کچھ خوراک کا بندوبست ہوا، مگر وبائیں پھیلتی ہیں تو کسی نہ کسی قدرتی مدافعتی نظام کے تحت بالآخر سمٹ جاتی ہیں، اب ان خبروں کا کیا کرنا کہ خوراک کے حصول کے لئے کتنوں میں ہاتھا پائی ہوئی، کسی کو گرم کپڑے مل گئے سینکڑوں سردی سے ٹھٹھر گئے، بانٹنے والوں نے آدھا مال گھروں میں رکھا چھینا جھپٹی، سینہ زوری، شیطانی افعال بکثرت ہوئے، آدھے زخمی طبیب تک رسائی کر پائے تو آدھے کھلے آسمان تلے پڑے رہے۔ لالہ وگل صورتیں ملبے کے نیچے گم ہو گئیں۔

وقت مشّاق درزی تو نہیں مگر بہر حال سمیٹنا جانتا ہے بخیہ سلائی، پیوند کاری آڑے ترچھے ٹانکے تروپے بھر لیتا ہے۔ انسان کو کاری ضربوں کے بعد، اس کے کٹے پھٹے دل کو گذارے لائق بھر دیتا ہے۔ چنانچہ وقت گزرا اور سب کو بھونچال بھول بھال گیا۔

شاہی اقبال بلند سے بلند تر ہوتا رہا۔ شاہی محلّات میں چین کی بنسی بجتے بجتے نہ تھکتی۔ خوشیاں اپنی سر تال میں اچھی بھلی جاری تھیں کہ یکا یک پھر ایک کریہہ شور نے سمع فراشی کی، حالانکہ بادشاہ سلامت وزراء کا بیڑا بھروا کر کسی عظیم انشان ملک کے کئی روزہ دورہ کے لئے روانہ ہونے ہی والے تھے۔ موسم گرما کی ابر آلود شام کے سائے تلے قسم قسم کے مشروبات اور دیس دیس کے عمدہ پھلوں کی طشتریاں قلب وجاں کو شادکام کر رہی تھیں۔ ماحول میں کیف وسرور تھا کہ نامانوس غل نے بدمزہ کر دیا۔ فریادیوں کے غول کے غول زنجیرِ عدل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگرچہ عدل کو زنجیر سے الگ کر کے برسوں پہلے کہیں لپیٹ دیا گیا تھا۔ زنجیر محفل ثقافتی نمونہ کے طور پر لٹک رہی تھی۔

شور شرابے سے شاہی جبیں شکن آلود ہوئی، جلال شاہی کا نشانہ بنتی وزیرِ خاص کی نگاہ، وزیرِ عام پر قہر بن کر برسی، وزیر عام نے مشیرِ خاص کو گھورا اور مشیرِ خاص مشیرِ عام کو دھمکی آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ مشیرِ عام نے دائیں بائیں سر گھمایا اور ماتحت نظر نہ آیا تو نظریں جھکا لیں۔

وزیر مواصلات دست بستہ لب کشا ہوا۔

''حضور کا بخت بلند ہو، فدوی عرض گزارنے والا ہی تھا کہ جنوبی دریاوں میں طغیانی آ گئی ہے۔ سینکڑوں بستیاں اور کئی قصبے زیرِ آب آ گئے ہیں، آفت زدہ لوگ پریشان ہیں۔ اس لئے حاضر ہوئے ہیں''

بادشاہ بھنّا کر بولا۔

''پریشانی میں ہمارے حضور کیوں حاضر ہو جاتے ہیں، ان کو اتنی سمجھ نہیں آتی کہ قدرتی آفات قدرتی ہوتی ہیں''

''حضور! آپ نے بجا فرمایا، لیکن ان کے گھر بار مال مویشی بہہ گئے ہیں۔ بے آسرا بے وسیلہ بے چارے کہاں جائیں''۔

''دعا کریں، ہم ابھی دعا کرائے دیتے ہیں''

''بادشاہ سلامت، جان کی امان پاؤں تو ناچیز کا مشورہ ہے اڑن قالین منگوا کر سیلابی بستیوں پر ایک مرتبہ سیر کر لیجئے''۔

''تمہارا ناقص مشورہ رد کیا جاتا ہے۔ تم ''اگر مگر'' بہت کرتے ہو۔ وزیر داخلہ قلمدان سمیت حاضر ہو''

وزیر مواصلات کا نپتا اشک بہاتا خارجِ دربار ہوا۔

جنوبی سیلاب زدگان کے لئے خاکی اور پیلے خیموں کی ٹکڑیاں جا بجا بچھیں اور یہ رقّت انگیز مناظر دنیا بھر کو دکھائے گئے، ایک بار پھر لدے پھندے قافلے اترنے لگے، منوں ٹنوں غذائیں، کمبل اور چادریں آنے لگیں۔ بہر حال رسد کی اتنی ریل پیل ہوئی کہ پکّی حویلیوں میں گائیں بھینسیں پیلے خیموں تلی بندھنے لگیں اور یو۔این۔او کے بسکٹ کھانے لگیں، غیر ملکی دودھ، چوکلیٹ کے پیکٹ دکانوں پر بکنے لگے۔

بادشاہ کو عوامی مصیبتوں سے اس حد تک سروکار رہوتا کہ وقتی شور مچتا، امداد کی کشکول گودام سے نکلوا کر قلعی کروا کے پھرائی جاتی۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ روگ بادشاہوں نے کبھی نہ پالے تھے۔ عوام کی اموات ہوتی رہتی ہیں۔ اجتماعی ہوں یا انفرادی ان پر رنجیدہ کبیدہ ہونا شاہی وصف نہیں۔

کچھ کوتاہ اندیش ''اپنے تئیں دانشور'' بادشاہ سلامت کی ذات سلامت پر انگشت نمائی کرنے لگتے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بادشاہ کی تملیکات ذاتیات خواہ وسیع در کائنات کیوں نہ ہو، اس کا حساب کتاب لگانا عوامی دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ بادشاہ تو آب و باد کا شاہ ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ ایسی منحوس خبروں سے بادشاہ سلامت رنجور ہوتے۔ شاہی طبیب اور شاہی جیب کو دن رات محنت کرنا پڑتی۔

ایک دن خبر رساں منزلوں پر منزلیں مارتا دربار میں حاضر ہوا اور ریاست کی دور کی بستی کی خبر لایا۔ وہاں قتلِ عام ہو رہا ہے، ہنستے بستے لوگ اغوا کر کے ان کی جان بخشی کے بدلے میں اشرفیوں سے بھری بوریاں طلب کی جاتی ہیں۔ اشرفیاں نہ ملنے کی صورت میں اغوا کنندہ کی بوری بند لاش بھیجی جاتی ہے۔ سخت خوف و ہراس ہے۔ لوگ باگ بادشاہ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور چارہ جوئی کے منتظر ہیں۔

بادشاہ یہ سن کر جلال کی کیفیت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جب بادشاہ کھڑا ہو جائے تو اس کا مطلب سب کا کھڑا ہو جانا ہوتا ہے اور اس کے لئے چپل ڈھونڈنے کی مہلت نہیں دی جاتی۔

''ہم اس بدامنی کی شدید مذّمت کرتے ہیں۔ یہ جلد بند ہو جانی چاہئیے''

بند کون کرے؟ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شاہی تخاطب غالباً کوئی غیر مرئی موکل تھا۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔

شاہی دن یونہی ہنسی خوشی بسر ہو رہے تھے کہ یکا یک ایک بڑی آفت ٹوٹ پڑی۔ رعایا پر تو آفتیں ٹوٹتی رہتی تھی۔ اور ایسے معمولی وقوعات کبھی تاریخ کا حصہ نہیں بنتے البتہ تاریخ کو اب کروٹ لے کر جاگنا پڑا۔ بادشاہ کے حریف مہاراجہ نے شب خون مار کر محل کو حراست میں لے لیا تھا۔ شاہی خانوادہ محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ دشمن بادشاہ کو ہتھیار ڈالنے اور جان بچا کر جلاوطنی قبول کرنے پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اس لئے محل کی روشنیاں منقطع کر دی گئیں۔

روشنیوں کا منقطع ہونا تھا کہ شہزادے، شہزادیاں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ ایک ایک لمحہ گزارنا اجیرن ہو گیا۔ بیگمات دہائی دینے لگیں، کنیزیں باندیاں جلے پاؤں کی بلّی کی طرح بے تاب پھرنے لگیں۔ تاریخ نے منہ میں انگلیاں داب لیں۔ ایسا ستم محل کے فلک پیر نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ ریاست تو اکثر اندھیرے میں ڈوبی رہتی تھی مگر ایسا اندھیر محل میں نہ مچا تھا۔ بادشاہ نے بے دست و پا ہو کے ہتھیار ڈال دیے۔

بہت سال گزر گئے۔ بادشاہ اب ایک امیر بوڑھا شخص رہ گیا تھا جو سرسبز جزیرے میں شطرنج کھیلتے کھیلتے دن گزارتا۔ ایک دن وہ لب آبِ جُو خاموش بیٹھا مچھلیوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا کہ ایک درویش کا وہاں سے گزر ہوا۔ درویش دور اندیش نے چند مکالموں کے تبادلے میں بادشاہ کے احوالِ گذشتہ کا برجستہ اندازہ لگا لیا۔ کہنے لگا۔

''ہمارے بادشاہ شہزادوں کو امور سلطنت کی تربیت درست نہیں دیتے۔ وہ تاریخ، فتوحات، علوم پڑھاتے ہیں۔ جسمانی مشقیں، تیر اندازی، گھڑ سواری، تیراکی وغیرہ بھی سکھاتے ہیں لیکن اپنے زیر سلطنت علاقوں کی بود و باش آب و ہوا، مسائل اور مصائب کا تجربہ اور مشاہدہ نہیں کراتے، رعایا کی بدقسمتی ہے کہ ایک کے بعد ایک ڈمی شاہی لباس پہن کر ان پر حکمرانی کرنے لگتی ہے''

بادشاہ درویش کی کھری گفتگو سن کر متاثر ہوا، پوچھنے لگا

''تو امور سلطنت کی تربیت کیسی ہو؟

درویش نے انگشت شہادت لہرا کر کہا

''جب تک بادشاہ تخت و تاج سنبھالنے سے پیشتر اپنی سمجھ دار زندگی کا ایک حصہ غریب رعایا کے ساتھ بالکل ان کی طرح نہیں گذارے گا، ان کے مدارس میں تعلیم کے کچھ مدارج طے نہیں کرے گا، ان کی خوراک تناول نہیں فرمائے گا، ان کی بیماری، لاچاری، بے روزگاری اور عسرت کو خود پر نہیں جھیلے گا تو کیسے ان اذہان و قلوب کو سمجھے گا جن پر وہ حکومت کرے گا.....''

یہ نصیحت زرّیں تھی۔ بادشاہ نے اسے ندی کے پانی پہ لکھ کر محفوظ کر لیا۔

اس وقت محل دوسرے بادشاہ کے قبضے میں تھا۔

اور محل کے باہر پھر شور بپا تھا۔ بادشاہ سلامت پوچھ رہے تھے۔

''یہ کیسا شور ہے؟

◆◆◆

کشمیری لال ذاکر (انڈیا)

O

جئیں گے تازہ گلاب بن کر، یہ طے ہُوا تھا
مریں گے خوشبو کا خواب بن کر، یہ طے ہُوا تھا

نہ تُم سے کوئی سوال ہو گا، عنایتوں کا
سُنوں گا سب کچھ، جواب بن کر، یہ طے ہُوا تھا

گذار دیں گے محبتوں کا قلیل وقفہ
گناہ کر کے، ثواب بن کر، یہ طے ہُوا تھا

گُلوں کے چہروں سے، سارے شبنم سمیٹ لیں گے
چھنے گی پھر وہ شراب بن کر، یہ طے ہُوا تھا

پڑھوں گا تم کو، لِکھوں گا تم کو یہ فیصلہ تھا
رہو گے میری کتاب بن کر، یہ طے ہُوا تھا

OOO

حسن عسکری کاظمی

O

بدل رہی ہے فضائے چمن مگر کم کم
کھلے ہیں پھر سے گل و یاسمن مگر کم کم

مری زمیں کا مقدّر نہ جانے کب بدلے
بدل رہا ہے نظامِ کہن، مگر کم کم

وہ میرے خواب میں آیا نہ کھل کے بات ہوئی
وہی ہے فطرتِ غنچہ دہن مگر کم کم

گزرتے وقت کا یہ معجزہ ستم ٹھہرا
کہ پرکشش ہیں خطوطِ بدن مگر کم کم

ابھی تو آئیں گی کچھ اور چاندنی راتیں
لگا ہے چاند سے رُخ کو گہن مگر کم کم

وہ آئے قبر پہ اُجلا لباس پہنے ہوئے
ابھی ہوا نہ تھا میلا کفن مگر کم کم

شبِ فراق گزاری ہے اوڑھ کر غم کو
وہ بے وفا ہے ملے گا حسنؔ مگر کم کم

OOO

شاہین (کینیڈا)

O

حبس سے دور گراں بار گھٹن سے باہر
روح جا بیٹھی ہے اپنے بدن سے باہر

اپنے ہونٹوں سے پھسل کر جو گرا، خود میں تھا
میں سخن ہی تھا بہرحال سخن سے باہر

وہی اک رشتہ، وہی تارِ نظر تھا سب کچھ
چاند بے چہرہ ہوا اپنی کرن سے باہر

گمرہی میری مجھے راہ پہ لا چھوڑتی ہے
میرے تلووں میں کوئی شے ہے تھکن سے باہر

گوپیاں گاؤں کی گلیوں کے گوالوں میں گھری
جا پہنچتی ہیں گھٹا پار گگن سے باہر

تجھ سے خوشبو کی طرح دور کہیں آ ملتا
کیوں پکارا نہ مجھے تو نے چمن سے باہر

پنکھ پھیلائے ہوئے صورتِ فردا سرِ شام
اک پرندہ نکل آیا تھا بدن سے باہر

وہ بھی شاہینؔ مری طرح پریشاں ہو گا
ہم وطن جس نے مجھے جانا وطن سے باہر

اعزاز احمد آذر

O

میں تو اس سوچ میں گُم ہوں کہ کدھر جاؤں میں
سامنے ایک قیامت ہے جدھر جاؤں میں

تُو بھی اوروں کی طرح سنگ بدست آ نکلا
اب یہی میرا مقدر ہے کہ مر جاؤں میں

ایسا سنّاٹا مسلّط ہے مرے چاروں طرف
کوئی پتہ بھی اگر ٹوٹے تو ڈر جاؤں میں

کِرچیاں کون سمیٹے گا شکستہ دل کی
اب تو بہتر ہے کہ چپ چاپ بکھر جاؤں میں

اس پُرآشوب زمانے میں سکوں کی خاطر
کیوں نہ اُن جھیل سی آنکھوں میں اُتر جاؤں میں

تیری منزل ہے اگر صبحِ درخشاں اے شب
پھر تو ہمراہ ترے تا بہ سحر جاؤں میں

میں براہیمؔ کا پوتا ہوں مگر آذرؔ ہوں
سُوئے بُت خانہ باندازِ دگر جاؤں میں

سعید احمد اختر

O

بس محبت کو عام کرنے کا
فن ہے دنیا میں نام کرنے کا

کوچ گھر سے کیا تو سوچیں گے
اُس گلی میں قیام کرنے کا

تو ملا تو خیال چھوڑ دیا
جامِ جم سے کلام کرنے کا

تیری تسبیح کا سہارا ہے
صبحِ زنداں کو شام کرنے کا

قصّہ خوانی میں کیا دھرا ہے شیخ
یہ زمانہ ہے کام کرنے کا

وعدۂ وصل جال تھا اختؔر
میری نیندیں حرام کرنے کا

OOO

کرامت بخاری

O

اِک سمندر ہے اور بھنور کتنے
جانے درپیش ہیں سفر کتنے

وہ زمانے تری رفاقت کے
آج لگتے ہیں مختصر کتنے

ہم کو اِس رہ گزارِ ہستی میں
سُکھ کے سائے ملے، مگر کتنے

موت کا مدّعا نہیں کُھلتا
دل میں بیٹھے ہوئے ہیں ڈر کتنے

حرفِ حق کی تلاش میں کب سے
لوگ پھرتے ہیں در بدر کتنے

اِک قلم ہے ہزار تحریریں
ایک رستے میں ہیں سفر کتنے

ہم سمجھتے ہیں باخبر جن کو
وہ بھی ہوتے ہیں بے خبر کتنے

OOO

بیدار سرمدی

O

ہم دونوں اور دریا اور کنارا ایک
جیسے چاند اور اس کے ساتھ ستارا ایک

چاند کے پاس امانت رکھ دی ہے میں نے
وہ جو تیری یاد تھی ایک، سہارا ایک

ٹوٹ کے گرنے والے پتّے سے پوچھو
کیسے اُس نے شاخ پہ سال، گزارا ایک

آج وہ پھولوں کا، تاروں کا، ساتھی ہے
کل تک سامنے تھا جو یار، ہمارا ایک

بس اک خواب کی خاطر سب سے روٹھ گیا
شہر میں رہتا تھا بیدار جو پیارا ایک

OOO

رفیع الدین ذکی قریشی

O

جو دُنیا کو لُوٹ رہے ہیں وہ ٹھہرے فرزانے ہیں
اور جو اپنے حال میں خوش ہیں، لوگ کہیں دیوانے ہیں

سب کے دلوں میں زہر بھرا ہے اُن کے ظاہر پر مت جا
اِس دُنیا کے رہنے والے سب جانے پہچانے ہیں

چھوڑ دیا ہے میخانہ بھی، عشقِ بُتاں بھی ترک کیا
جب سے پی ہے اُن آنکھوں سے، چُھوٹ گئے میخانے ہیں

جس کو شک ہو ساتھ چلے اور پل بھر بیٹھ کے دیکھ آئے
ساقیٔ مہ وش کی آنکھیں یا مَے سے بھرے پیمانے ہیں

صرف تصنّع اور بناوٹ آج کی ایک حقیقت ہے
مہر و وفا' اخلاص و مرّوت، یہ سارے افسانے ہیں

خول چڑھا رکھے ہیں سب نے کیا اپنے کیا بیگانے
جانے پہچانے چہرے بھی جیسے سب انجانے ہیں

ہر غم پر مُسکاتے ہیں، دُکھ سہہ کر بھی، ہنستے ہیں ذکی
دیوانوں کی بات نہ پوچھو دیوانے دیوانے ہیں

OOO

ڈاکٹر شبابؔ للت (انڈیا)

O

جہاں تک تیرے اُجیالے ملیں گے
وہیں تک چاہنے والے مِلیں گے
جہاں فُٹ پاتھ کے پالے ملیں گے
وہیں کچھ لوگ دل والے ملیں گے
زبانوں پر اُگاتے ہیں جو سُورج
اُنہی کے دِل بہت کالے ملیں گے
یہاں سچ بول کر پچھتاؤ گے تم
تمہیں بھی زہر کے پیالے ملیں گے
دھری رہ جائے گی تفتیش ساری
زبانوں پر وہاں تالے ملیں گے
مروّت کے عوض گالی ملی ہے
محبت کے عوض بھالے ملیں گے
ہمارا دل وہ اُجڑا گھر ہے جس میں
غموں کے ہر طرف جالے ملیں گے
کوئی پل کی ہے جوبن دُھوپ اب تو
سروں پر برف کے گالے ملیں گے
یہاں سب کی زبانیں قینچیاں ہیں
کہاں دِل جوڑنے والے ملیں گے؟
جہیزی آگ میں وہ جل مرے گی
فضا میں بے اثر نالے ملیں گے
میاں! گھر لوٹ کر بھی کیا کرو گے؟
مسائل چھاؤنی ڈالے ملیں گے
شبابؔ اُس بزم میں جانا سنبھل کر
وہاں آفت کے پر کالے ملیں گے

سلیمان خمار (انڈیا)

O

کہانی میری تا حدِّ گماں رکھی ہوئی ہے
ہر اک منظر میں میری داستاں رکھی ہوئی ہے
ابھی ٹوٹے نہیں ہیں سانس کی ڈوری سے رشتے
ابھی اس پیکرِ خاکی میں جاں رکھی ہوئی ہے
جہاں خدشہ لگا رہتا ہے اکثر بجلیوں کا
وہیں ہم نے بنائے آشیاں رکھی ہوئی ہے
ہدف کے تیر تو سارے ہمارے ہاتھ میں ہیں
اور اُس کے پاس بس خالی کماں رکھی ہوئی ہے
دلِ مجروح کی اُس سے رفاقت خوب ہو گی
سُنا ہے درد کی اُس نے دُکاں رکھی ہوئی ہے
اسی کو عمر بھر کے عشق کا حاصل سمجھ لیں
جواک دوری ہمارے درمیاں رکھی ہوئی ہے
ہر اک گھر سے اُبھرتی تھیں صدائیں قہقہوں کی
ہر اک کھڑکی میں اب آہ و فغاں رکھی ہوئی ہے
اگر مل جائے تم کو تو خبر کرنا ہمیں بھی
متاعِ عافیت جانے کہاں رکھی ہوئی ہے
خموشی بات کرتی ہے ہمارے ساتھ اکثر
خموشی کے دہن میں بھی زباں رکھی ہوئی ہے
چلو ہم بھی خمارؔ خوش نوا سے آج مل لیں
وہی جس نے الگ طرزِ بیاں رکھی ہوئی ہے

کرشن کمار طُور (انڈیا)

O

ہوا میں زورِ ہوا کچھ نظر نہیں آتا
نہ ہوں جو صِدق و صفا کچھ نظر نہیں آتا

طلوعِ مہر، نشانِ نفس، وصالِ یار
ہماری آنکھ کو کیا کچھ نظر نہیں آتا

یہ گمرہی کی ہے منزل کہ ہے خودی کا وفور
خدا بہ نامِ خدا، کچھ نظر نہیں آتا

ہے جب سے ڈالا ان آنکھوں میں عشق کا سُرمہ
مجھے تو اِس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

یہ بخت کے ہیں وسیلے زمیں سے حدِ فلک
ہما کہ بالِ ہما کچھ نظر نہیں آتا

وصالِ غیر ہو یا ہو دعائے خیر کی بات
میانِ ترکِ وفا کچھ نظر نہیں آتا

دلیل ہونے نہ ہونے کی بے اثر ہے طوؔر
نہ آنکھ ہو تو سدا کچھ نظر نہیں آتا

OOO

پرتپال سنگھ بیتاب (انڈیا)

O

مرے ریگزار وجود کو تُو نے سبز باغ بنا دیا
حدِ ممکنات سے ہے پرے مُجھے ایسا خواب دِکھا دیا

مَیں بھٹک رہا ہُوں خلا خلا رکھوں پاؤں اب تو کہاں رکھوں
تُو نے آب وگل سے اُکھاڑ کر مجھے آسماں میں اُڑا دیا

مَیں تو سوچتا تھا تِری دوا مرے عارضے کا علاج ہے
اے طبیب تُو نے یہ کیا کیا مرا درد اور بڑھا دیا

یہ تمہارا کھیل عجیب ہے کہیں تیرگی کہیں روشنی
کہیں اِک چراغ جلا دیا کہیں اِک چراغ بُجھا دیا

کوئی راستہ ہی بدل گیا کوئی مسکرا کے نکل گیا
سرِ راہ جو بھی ہمیں ملا اُسے دل کا زخم دِکھا دیا

OOO

ڈاکٹر محبوب راہی (انڈیا)

O

قطرہ، جھرنا، دریا، ابر، سمندر میں
ایک سلگتی جلتی پیاس سراسر میں

ایسے برتیں مجھ کو میرے اپنے لوگ
جیسے کوڑا کرکٹ، کنکر پتھر میں

ایک درندہ ہوں خواہش کے جنگل کا
سادھو سنت، نہ کوئی پیر پیمبر میں

سجدہ گاہوں میں بھی ریاکاروں کی بھیڑ
رکھوں کس دہلیز پہ اب اپنا سر میں

وقت کا دھارا مجھ سے ہو کر بہتا ہے
کٹتا رہتا ہوں اندر ہی اندر میں

خود غرضوں ابن الوقتوں کی یہ دنیا
اخلاص و سادہ لوحی کا پیکر میں

جب تک اردو زندہ ہے راہیؔ صاحب
جھلکوں گا شعروں میں منظر منظر میں

OOO

ڈاکٹر محبوب راہی (انڈیا)

O

رات، تنہائی، مرا گھر اور میں
گرم سانسیں، سرد بستر اور میں

پیاس سے باطن کی چاروں جاں بہ لب
ابر تر، دریا، سمندر اور میں

چاہتوں کے غنچہ و گل اور وہ
نفرتوں کے تیر و نشتر اور میں

اپنی اپنی آگ میں جلتے رہے
شمع، خورشیدِ منور اور میں

بارشِ سنگِ ملامت، کو بہ کو
اک مرا شیشے کا پیکر اور میں

آگ، چیخیں، موت، بربادی، دھواں
خاک و خوں منظر بہ منظر اور میں

روپ میرے تین ہیں، اک شخصیت
ایک راہیؔ، ایک رہبر اور میں

OOO

خان پرویز (لندن)

O

بکھری نیندوں، ٹوٹے خوابوں نے لی ہے انگڑائی
دل کی دھڑکن یوں ہے جیسے دُور بجے شہنائی

دہر کے ہنگاموں سے گذرے اور بہت سے لوگ
کرب نے صدیوں میرے ہی سر میں کیوں دُھول اُڑائی

کس دن ایوانوں پہ ہو گا مزدوروں کا راج
کس دن میزانوں سے ہو گی فصلوں کی بٹوائی

محنت کش کب دیکھ سکیں گے خوشحالی کا چہرہ
قریہ قریہ ناداروں کی کب ہو گی شنوائی

تسخیرِ افلاک میں انساں، کس کی کھوج میں نکلا
اس کی اپنی ذات نہ جسم کے خول سے باہر آئی

اک دیوار پہ لکھا دیکھا تیری گلی کا نام
میری رگ رگ میں اُگ آئی تیری یاد کی کائی

تیرے کانوں کے آویزے بن گئے چاند اور سورج
میرے ہونٹوں پر غزلوں اور گیتوں کی پہنائی

رات کے پچھلے پہر ندی میں جیسے چاند ہو اُترا
جام پہ یوں لرزاں ہے تیری بل کھاتی انگڑائی

وُہ بیمار کے بالیں بستر پر پرویزؔ نہ آئے
اُکھڑی سانسوں پر یہ اُبھرا، تنہائی تنہائی!

شفیق احمد فاروقی (مدینہ منورہ)

O

جب رات کی گہری نیندوں میں، خوابوں کا بسیرا ہوتا ہے
ہم عشق کے مارے لوگوں کا، اُس وقت سویرا ہوتا ہے

جب یادیں لوٹ کے آتی ہیں، اور ذکر بھی اُن کا چھڑتا ہے
اَشکوں کے دیئے جَل اٹھتے ہیں، تب دُور اندھیرا ہوتا ہے

اِک بستی ہر شب بستی ہے، اِک بستی روز اُجڑتی ہے
دل والوں کا اِس کوچے میں، ہر رات ہی پھیرا ہوتا ہے

کچھ عشق کی باتیں ہوتی ہیں، اور پیار کی گھاتیں ہوتی ہیں
اِک من موہن سی صورت کا، دل میں جب ڈیرا ہوتا ہے

جب پیار سے قربت بڑھتی ہے، اور عشق سے دُوری مٹتی ہے
جب عشق کسی سے ہو جائے، کب میرا تیرا ہوتا ہے

کچھ اور ہی پریت کا عالم ہے، کچھ اَور ہی مَن کی باتیں ہیں
دُنیا میں شفیقؔ اِس شان سے بھی، اِک سانجھ سویرا ہوتا ہے

OOO

باقر رضا

O

کتاب چہرہ کھلا ہوا ہے تمام احباب آ چکے ہیں
دلوں کی محفل سجی ہوئی ہے نا دوریاں ہیں نہ فاصلے ہیں

ہماری آغوش میں جہاں ہے ہمارے دامن میں کہکشاں ہے
نئی ہواؤں کے دم قدم سے، نئے شگوفے کھلے ہوئے ہیں

تو کیا ہم اب تک ہیں یادان کو، تو کیا وہ ہم کو بھلا نہ پائے
ہزاروں میلوں کے فاصلے سے، ہمارا احوال پوچھتے ہیں

کچھ ہم نے خود کو سمجھ لیا ہے، کچھ ہم نے خود کو نہیں ہے جانا
کچھ آپ ہم کو بتا رہے ہیں، کچھ آپ ہم سے چھپا رہے ہیں

دکانداری کی اشتہاری میں کام تبلیغ کا ہے جاری
مزاج بے حد ہے کاروباری، ثواب و نفع ملے جُلے ہیں

پرانی تصویر ہم نے دیکھی کتاب چہرے پہ کل رضاؔ کی
عجیب پہلے بھی کم نہیں تھے، عجیب تر اور ہو گئے ہیں

OOO

میثم علی آغا

O

دشت میں رخت نہ دے خواب کی مہلت دے دے
کم سے کم عشق میں اتنی تو سہولت دے دے

اِک سکوں میرے تعاقب میں چلا آتا ہے
زندگی مجھ کو نئے دُکھ کی بشارت دے دے

کوئی مقتل سے بلاتا ہے سو محبوب مرے
اب ہمیشہ کے لئے عشق سے رخصت دے دے

میں نے دیکھا ہے اذیت کو پریشاں ہوتا
میرے اللہ مرے زخم کو وسعت دے دے

یہ جو پامال شدہ لاشے ہیں سب میرے ہیں
میرے آقا مجھے رونے کی اجازت دے دے

میرے تابوت کے وارث ہیں مرے گریہ گذار
اے خداوندِ عزا اِن کی ضمانت دے دے

OOO

عبدالجبار آثر

O

ہو دوستی کسی سے تو چاہت کے ساتھ ہو
دشمن سے دشمنی بھی شرافت کے ساتھ ہو

تعظیم اس کی روحِ عقیدت کے ساتھ ہو
جو کچھ خدا سے مانگیں لجاجت کے ساتھ ہو

ہو حسیّت جدید مگر اے ادب نواز
''جدت کو چاہئے کہ روایت کے ساتھ ہو''

جو آج کے ہیں کام وہ کل پر نہ ٹالئے
کل جانے کیا معاملہ قسمت کے ساتھ ہو

کرنا ہو کارِ خیر تو یہ بھی رہے خیال
مہر و وفا خلوص و محبت کے ساتھ ہو

نفرت بھی ہو کسی سے تو شائستگی یہ ہے
اظہار جیسا بھی ہو شرافت کے ساتھ ہو

ذلّت کی زندگی سے تو بہتر ہے موت آثر
جینا ہے لازمی مگر عزّت کے ساتھ ہو

OOO

ندیم ہاشمی

O

رات آنکھوں میں رَت جگے ہوں گے
تِری فرقت کے سلسلے ہوں گے

منزلِ خواب کی تمنا میں
اب بھی رستوں میں قافلے ہوں گے

پھر تحیّر زدہ فضائیں ہیں
پھر سے حیرت میں آئنے ہوں گے

کیا خبر تھی کہ دُور بیٹھیں گے
کیا خبر تھی کہ فاصلے ہوں گے

دھوپ چھاؤں کا کھیل جاری ہے
زندگی ہے تو حادثے ہوں گے

منزلِ شوق کی پناہوں میں
منتظر کتنے راستے ہوں گے

ہاشمی آرزو کے میلے میں
جانے کتنے معاملے ہوں گے

OOO

شہزاد نیّر

O

خوابِ تجسیم کے آزار میں آسانی کو
اوڑھ لیتا ہوں ترے جسم کی عریانی کو

واپس آئے تو در و بام بھی اپنے نہ رہے
ہم کہ گھر چھوڑ کے نکلے تھے جہاں بانی کو

پہرے داروں نے مرے قتل میں عجلت کی ہے
میں تو آیا تھا ترے گھر کی نگہبانی کو

اب تو خواہش ہے کہ گھر میں کوئی سیلاب آئے
اور لے جائے مری بے سر و سامانی کو

خوف کھائیں گے تو ویرانے میں مر جائیں گے
تم یہاں آگ جلاؤ' میں چلا پانی کو

بے سبب کوئی یہاں خوابِ پریشاں لایا
ہجر کافی تھا مری آنکھ کی ویرانی کو

وہ اگر ڈھانپ دے تعبیر سے مجھ کو نیّر
چھوڑ دوں خوابِ برہنہ کی پشیمانی کو

OOO

امتیاز کاظمی

O

یوں بہت ہے غم کا سایا آنکھ میں
جانے کیوں آنسو نہ آیا آنکھ میں

خواب میں بستا ہے میری اِک جہاں
پھر بھی تجھ کو کیوں نہ پایا آنکھ میں

آنکھ اُس کی گویا ہے قوسِ قزح
رنگ یہ کیسا جمایا آنکھ میں

نیند مجھ کو پھر نہ آئی عمر بھر
خواب کچھ ایسا جگایا آنکھ میں

اُس کو دیکھا کل جو میں نے رات کو
ایک جگنو جگمگایا آنکھ میں

آنکھ کا شہتیر کیوں آئے نظر
تنکا اِک ایسا گرایا آنکھ میں

زیرِ لب تھی مسکراہٹ امتیاز
اِک اشارہ سا وہ لایا آنکھ میں

OOO

عظیم راہی

O

ہمارا آنہ آنہٗ پائی پائی مختلف ہے
سُن اے قارون! محنت کی کمائی مختلف ہے

بظاہر لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں دونوں
مگر پانی الگ ہے اور کائی مختلف ہے

ہمارے خواب کو تعبیر کی ترغیب مت دو
یہ سودا اور ہے، اِس کی ادائی مختلف ہے

عجب ہے بارگاہِ عشق جس میں عاشقوں کی
رسائی مختلف ہے، نارسائی مختلف ہے

گِلہ احباب سے بے گانگی کا کیا کریں ہم
طبیعت ہی ہماری انتہائی مختلف ہے

کسی کی آرزوؤں کا لہو شامل ہے اُس میں
سو شاخِ گل سے وہ دستِ حنائی مختلف ہے

تجھے حق بات سُننے کی اگر عادت نہیں تو
مجھے مت چھیڑ! میری لب کشائی مختلف ہے

مجھے بے چین رکھتی ہے کسی کی آخری چیخ
اِسی باعث مری نغمہ سرائی مختلف ہے

روبی جعفری

O

اک ہجومِ رقص ہے بہار آ کہ ہم بھی ہیں اِدھر
فطرتِ نگہ میں حُسن ہے فگار آ کہ ہم بھی ہیں اِدھر

غموں کی کیفیت میں ڈھل کے آ کہ پھر سمٹ سکیں
ستارے نوکِ مژہ پہ ہیں بے شمار آ کہ ہم بھی ہیں اِدھر

ان ہواؤں میں یہ خود کلامیاں ہیں گو مگو
درد آشنا ہے قوسِ نو بہار آ کہ ہم بھی ہیں اِدھر

دریچہ وا ہوا تو ہم بھی داخل اس میں ہو گئے
کھلا جو دل تو زخم تھے ہزار آ کہ ہم بھی ہیں اِدھر

کبھی ہنسے کبھی وفورِ درد سے بہل گئے
دلِ حزیں ہے کشت میں شمار آ کہ ہم بھی ہیں اِدھر

نگاہِ شوق میں ہم اجنبی کے اجنبی رہے
فضا کا بن گئے غبار، آ کہ ہم بھی ہیں اِدھر

OOO

ڈائری

سنگریزے اور جواہر

غلام الثقلین نقوی

''غلام الثقلین نقوی اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ناول نویس تھے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''شفق کے سائے''.....''بند گلی''.....''نغمہ اور آگ''.....''سرگوشی''.....چھپ کر مشہور ہو چکے ہیں۔ ان کا ناول ''میرا گاؤں'' شائع ہوتے ہی 'کلاسیک' کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ ''چل بابا اگلے شہر'' اور ''ارضِ تمنّا'' ان کے سفر نامے اور ''اک طرفہ تماشا'' ان کے مزاح پاروں کا مجموعہ ہے۔ 1980ء کی دہائی کے آخر میں انہوں نے اپنے تاثرات کو ڈائری کی صورت میں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان کی یہ ذاتی ڈائری ان کی وفات (6/اپریل 2002ء) کے قریباً دس برس کے بعد ان کے کاغذات سے برآمد ہوئی ہے۔ زمانی حالات پر نقوی صاحب کا تاثر اگرچہ ذاتی ہے لیکن اس میں ادبی دلچسپی کے عناصر موجود ہیں۔ اس ڈائری کے چند اوراق قارئین کی نذر کیے جاتے ہیں۔ غلام الثقلین نقوی اظہر جاوید کے دوست اور ''تخلیق'' کے مستقل قلمی معاون تھے۔ ہم جناب سجاد نقوی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے غلام الثقلین نقوی کی ڈائری کے چند ''اوراق'' اشاعت کے لیے ''تخلیق'' کو عنایت فرمائے ہیں۔ (ادارہ)

.....

مردہ بستی اور بے یقینی کا عذاب

''17/فروری 1981ء سے افسانہ مجھے چھوڑ گیا ہے۔'' (افسانے کا عنوان ''اِک بوند لہو کی'') یہ میرے افسانوں کے آخری مجموعے ''دھوپ کا سایہ'' کے دیباچے کا دوسرا جملہ ہے۔ 14 نومبر 1987ء کی صبح کو ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے 'ایک افسانہ' مکمل کر لیا۔ یہ نامکمل افسانہ ایک مدت سے میری ایک نوٹ بک میں اُدھورا پڑا ہوا تھا۔ اس کا انجام نہیں سوجھ رہا تھا۔ اُس صبح کو سوجھ گیا اور افسانہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ میں بہت خوش ہوا کہ روانیِ طبع پر جو بند لگ گیا تھا، وہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں حیران بھی ہوا کہ ''افسانے'' کے ساتھ ٹوٹا ہوا رابطہ اتنی آسانی سے کیسے بحال ہو گیا۔ حیرت اب تک قائم ہے اور خوشی باقی نہیں رہی۔ کیونکہ جس افسانہ نگار نے یہ افسانہ مکمل کیا تھا، وہ پھر اپنے خول میں سمٹ گیا ہے۔ اس کا پسِ منظر یوں ہے۔

12/اکتوبر کو ایف۔سی کالج کے صدرِ شعبۂ اُردو ڈاکٹر آغا سہیل صاحب نے فون کیا کہ ٹیلی ویژن لاہور کے پروڈیوسر محمد عظیم صاحب ایک ادبی پروگرام میں آپ سے ایک افسانہ پڑھوانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی افسانہ موجود نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ لکھ لیجیے یا کسی پرانے افسانے میں قطع و برید کر لیجیے۔ ایک دو افسانے دیکھے لیکن ''خلاصہ'' لکھنے کو جی نہ چاہا۔ 13/اکتوبر کو محمد عظیم صاحب کے اسٹسٹ پروڈیوسر تشریف لائے۔ وہ کہنے لگے کہ کوئی ایسا افسانہ لکھیے جو علامتی ہو اور اُس پر اچھی بحث ہو سکے۔ اچانک ذہن اِس اُدھورے افسانے کی طرف منتقل ہوا۔ پرانی نوٹ بک کی تلاش میں کئی گھنٹے صرف ہو گئے۔ سوچا کہ صبح کوشش کروں گا۔ 14/اکتوبر کی صبح کو نو بجے یہ افسانہ 'اچانک' مکمل ہو گیا۔ اُسی دن ریکارڈ ہو گیا۔ اُس دن بند نزلے زکام کی وجہ سے اعضا شکی ہو رہی تھی اور بخار کی کیفیت تھی۔ سانس کی تکلیف بھی تھی۔ وینٹولین اِن ہیلر کے دو مرتبہ کش لینے پڑے۔ ریکارڈنگ کے دوران اختلاجِ قلب رہا اور ہاتھ بھی کانپتے رہے۔ ابھی یہ پروگرام 'ٹیلی کاسٹ' نہیں ہوا ورنہ اپنی حالت پر ہنسنے کا موقع مل جاتا۔ اِس پروگرام کا نام ''بزم'' ہے۔

.....

چھٹی کُل اہلِ قلم کانفرنس (18,17 اکتوبر 1987ء)

''چھٹی کُل اہلِ قلم کانفرنس'' کا دعوت نامہ ملا تو بہت خوشی ہوئی۔

ایک مدّت سے لاہور سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ میری بیٹی پنڈی میں رہتی ہے۔ دو سال پہلے پچھلی اہلِ قلم کانفرنس میں اُس کے ہاں دو تین روز رہا تھا۔ اگرچہ وہ لاہور میں آ کر دو تین بار مل گئی تھی لیکن اُسے گلہ تھا کہ میں اُس سے ملنے راولپنڈی نہیں آتا۔

اِس سال گرمیوں میں پختہ ارادہ تھا کہ پنڈی جاؤں گا اور مری یا ایبٹ آباد میں جا کر پہاڑوں کا نظارہ کر لوں گا۔ پہاڑوں سے مجھے بہت محبت ہے اور انہیں دیکھ کر روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے روح اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہو۔ میدانوں میں رہ کر زمین سے قدم چپک جاتے ہیں اور اب جُوں جُوں موت قریب تر آتی چلی جا رہی ہے، یُوں لگتا ہے جیسے قبر کی تنگنائی کے تصوّر سے دَم گھٹ رہا ہو (ممکن ہے کہ اِس تصوّر میں دَمے کی وجہ سے 'ضیق النفس'' کی جو کیفیت محسوس ہوتی ہے، اُس کو بھی کچھ دخل ہو)۔ لیکن یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ جماعت نہم و دہم کی اُردو کی درسی کتاب کی ترمیم و اصلاح میں گرمیوں کا تقریباً ڈیڑھ مہینہ صرف ہو گیا اور ''جہدِ روزگار'' نے رومانوی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ یوں تو اب بھی دل میں ہزاروں خواہشیں موجود ہیں، لیکن دو خواہشوں پر واقعی دم نکلتا ہے۔ ایک خواہش تو کربلا، نجف، بغداد اور مشہدِ مقدس کی زیارات کی ہے اور دوسری پاکستان کے کوہستانی علاقے کی سیر۔ صدر صدام کو شکست ہو تو عراق کا راستہ کھلے۔ ایران حق پر ہے لیکن حق کو باطل پر غالب آنے میں بہت دیر لگتی ہے (اور اَب تو باطل کی امداد کے لئے شیطانِ بزرگ امریکہ بھی خلیجِ فارس میں اُتر آیا ہے۔ خدا اسے برباد کرے!)۔ یوں لگتا ہے کہ کربلا و نجف ابھی بہت دُور ہیں۔ رہی پاکستان کے کوہستانی علاقے کی سیر تو اِس کے لئے ایک ساتھی

اور جسمانی ہمت کی ضرورت ہے۔ ساتھی بھی کوئی نہیں ملتا اور جسمانی ہمت کی سطح اتنی پست ہے کہ ایک میل پیدل چل کر جسم توانائی سے یکسر محروم ہو جاتا ہے۔ مزہ تو اِسی میں ہے کہ بس پر سفر کیا جائے اور راستے کے کوہستانی نظاروں سے محظوظ ہوا جائے۔ یہ ناممکن ہے اور اتنی مالی فراغت نہیں کہ ہوائی جہاز پر سفر کیا جائے اور شانگری لا میں قیام کیا جائے۔ یہ ضمنی جملہ بہت طویل ہو گیا۔

اسلام آباد میں تین راتیں رہنے کا موقع ملا۔ قیام ''ہالی ڈے اِن'' کے کمرہ نمبر 112 میں تھا۔ صبح نماز پڑھ کر شیشے سے پردہ سرکاتا تو ''مارگلا'' کے پہاڑ لپک کر آتے اور کھڑکی سے مل جاتے۔ ایک عجیب سا کیف دل و دماغ کو اپنی بھرپور آغوشِ محبت میں لے لیتا۔ جوشؔ نے تو کہا تھا کہ ہم اہلِ نظر..... میں کہتا ہوں کہ ہم جیسے کمزور ایمان لوگوں کے لئے رسولؐ نہ بھی آتے تو صبح کافی تھی، صرف اس تعریف کے ساتھ درست معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسولوںؑ میں سے ایک رسول اُس کی 'صبح' بھی ہے۔ اسلام آباد کی یہ دُھلی دُھلائی، صاف و شفاف صبح 'ایمان' میں اضافے کا باعث ہوتی۔

اِس کمرے میں رحمٰن مذنب میرے ساتھ تھے۔ صبح سیر کے لئے باہر نکلتے تو سڑکوں کے اردگرد جنگلوں کا منظر اِس کیف میں اور بھی اضافہ کرتا۔ رحمٰن مذنب صاحب سیر کے بہت شیدائی ہیں۔ ایک دن پہاڑوں پر کالے کالے بادلوں کا منظر بھی دیکھا جو اُن کی چوٹیوں کو چھو رہے تھے۔ جی تو چاہتا تھا کہ پہاڑ پر کھڑے ہو کر نیچے وادیوں میں اُڑتے ہوئے بادلوں کا منظر دیکھا جائے لیکن اس کے لئے مری نہ جا سکا۔ وہاں موسم کی پہلی برف پڑی تھی اور میرے پاس گرم کپڑے نہیں تھے۔ یوں بھی صحت خاصی کمزور ہے۔

اِس بار چھٹی اہلِ قلم کانفرنس میں آٹھ سو پچاس ادیب شامل ہوئے۔ دیہات اور قصبات کے ادیبوں کو بھی شامل ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔ صوبائی اور لسانی وحدت پیدا کرنے کے لئے اتنا بڑا اجتماع اپنا جواز آپ تھا۔ بہت سے ادیبوں سے ملاقائی ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں زعما شامل نہیں ہوئے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید صاحب فلیش مین ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ کانفرنس کے اجلاس میں اُن سے ملاقات ہوتی رہی۔ رحمٰن مذنب میرے دیرینہ دوست ہیں۔ اُن کا ساتھ بہت خوشگوار ثابت ہوا۔ اسلام آباد بہت خوبصورت شہر ہے۔ اللہ کرے کہ اس کی وسعت اور کشادگی میں بڑے شہروں کی گھٹن اور تعفن پیدا نہ ہو۔

پنڈی کی ڈھوک کھبا میں آ کر محسوس ہوا کہ خوشبو اور بدبو میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ میرے داماد کا کرائے پر لیا ہوا مکان بہت تنگ ہے۔ قریب ہی گندا نالہ ہے۔ سامنے ایک پلاٹ خالی ہے جس میں سارا محلّہ اپنا کوڑا کرکٹ پھینکتا ہے۔ جس کمرے میں مَیں سوتا تھا، اُس کے باہر کھلنے والے دروازے کے قریب گٹر ہے جس سے وقفے وقفے کے بعد بدبو کے بھبکے آتے تھے۔ کمرے کے اندر خوشبو والی بھاپ چھڑکی گئی تھی، پھر بھی 'بدبو' نے ناک میں دم کیے رکھا۔

''ہالی ڈے اِن'' کی تین راتیں سوتے جاگتے ابوالحسن کا خواب معلوم ہونے لگیں۔ بیوی نے خواہش کی کہ اُسے فیصل مسجد دکھائی جائے۔ چنانچہ بیوی اور لڑکی کو فیصل مسجد لے گیا۔ جدید دور کے جلال و جمال کی مظہر اِس مسجد نے بہت متاثر کیا، مارگلا

کی ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کے ماحول میں بھی ایک خاص طرح کی رفعت کا احساس ہوتا ہے۔ اِس کے ساتھ وسیع لان ہیں۔ دھوپ کی بے داغ چادر نے اِس منظر کے حُسن میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ آسمان پر اُس دن بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ پہاڑ کے سرسبز دامن پر نظر جما کر آسمان کی طرف دیکھتا تو دھوپ کے باوجود وہ گہرا نیلا نظر آتا۔ نیلے رنگ سے شاید اِسی وجہ سے مجھے بہت پیار ہے۔ مسجد سے واپسی پر اُن خوبصورت کوٹھیوں کو بصد حسرت دیکھا جو اِس خوبصورت منظر کا ایک جزو بن کر اُس سے کسبِ حُسن کر رہی تھیں۔ اِن کوٹھیوں کے مکین کتنے خوش قسمت ہیں کہ صبح سے شام تک کے بدلتے ہوئے حسین مناظر کا ایک جزو بن گئے ہیں!

کاش اِس جگہ پر مجھے ایک ''کُٹیا'' ہی مل جاتی! کیا پتہ عبادت میں اُس قطرۂ شبنم کی تمنّائے رفعت پیدا ہو جاتی جو سورج کی ایک کرن میں مدغم ہو کر سوئے فلک پرواز کر جاتا ہے! ''رشک وحسد'' کی اِس طوفانی لہر میں بہت عرصے تک ڈوبا رہا۔ سوچا! اِلٰہی! اسلام آباد کے اِن محلات میں رہنے والے بھی تیرے ہی بندے ہیں اور وہ بھی جو ڈھوک کھبا کے ایک تنگ و تاریک اور بدبودار مکان میں رہنے پر مجبور ہیں، تب اپنے سے کم تر لوگوں کی طرف نظر کی، تو شرم آئی۔ سوچا کہ اِس ذلیل کن اور رُسوائی آمیز نظامِ معیشت کا پرزہ ہو کر اس پر مطمئن ہونا انسانیت کی کتنی بڑی تذلیل ہے۔ انسان کو نہ جانے اِس ذلتِ نفس سے کب نجات ملے گی!

اُس صبح اسلام آباد جاتے ہوئے وہ قبرستان بھی دیکھا جہاں ڈھوک کھبّا کے ہولناک قتل کے مظلوم بارہ مقتول دفن ہیں۔ وہ مکان بھی دیکھا جس میں ہتھوڑا گروپ کے قاتلوں نے یہ خوں ریز ڈراما کھیلا!

اس واقعے کی یاد نے رونگٹے کھڑے کر دیئے!

ظلم وشقاوت کے اِس حادثے کی یاد کو بہت مشکل سے ذہن سے محو کیا!

◆◆◆

ماہنامہ عِصمَت کراچی

بانی مصورِ غم علامہ راشد الخیری

نئی آب وتاب سے مدیرِ اعلیٰ جمیل احمد صدیقی کے زیرِ نگرانی شائع ہو رہا ہے۔

پتہ: الاکو ہاؤس، کمپاؤنڈ ڈنڈاس اسٹریٹ آف عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی

(فون: 021-5651555 سیل: 0300-2400825)

انشائیہ

تھکن

سلیم آغا قزلباش

کیا آپ نے کبھی تھکن محسوس کی ہے! یقیناً کی ہوگی کیونکہ یہ ایک ایسی کیفیّت ہے جس میں ہر کوئی مبتلا ہوسکتا ہے تاہم تھکن کی بظاہر کئی جانی پہچانی صورتیں ہیں مثلاً عام جسمانی تھکن، ذہنی تھکن، اعصابی تھکن یا پھر کسی علالت کی عطا کردہ تھکن وغیرہ۔ مگر سوچنے کی بات ہے، کیا تھکن محسوس کرنا ایک فطری یا طبعی ردِّعمل ہے یا اسے عناصر کی بے اعتدالی یا کسی اندرونی خلفشار کا ڈھکا چھپا اظہار کہنا چاہیئے!

میرے ایک کرم فرما موقع ملتے ہی تھکن کے موضوع پر بے تکان لیکچر دیئے جانے میں ذرا تھکن محسوس نہیں کرتے۔ وہ اکثر فرماتے ہیں: بیزاری، یکسانیت، اضمحلال اور عدم دلچسپی تھکن کے بنیادی اوصاف ہیں اور پھر وہ اس کے ڈانڈے طبقاتی کشمکش اور سرمایہ دارانہ نظام کی پروردہ نفسیاتی اُلجھنوں سے ملا دیتے ہیں۔ ان کی اس اَن تھک تقریر کے باعث میں سرتاپا تھکن سے چُور چُور ہو جاتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نوعیت کی تھکن کچھ دیر آرام کرنے سے زائل ہو جاتی ہے اور آدمی دوبارہ کھل اُٹھتا ہے، مگر وہ تھکن جو آرام کرنے کے باوجود آکاس بیل کی طرح ذہن اور بدن سے لپٹی رہے، ایک قابلِ غور مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بالعموم یہی کہا جاتا ہے کہ آج کی تیز رفتار زندگی نے فرد کو چونکہ ذہنی اور جسمانی دونوں سطحوں پر مضمحل کر دیا ہے، لہٰذا اس پر تھکن کا دورہ گاہے بگاہے پڑتا رہتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے چاروں طرف بکھری نوع بہ نوع دلچسپیوں کے ہوتے ہوئے، تھکن کے وارد ہونے کی بھلا کیا منطق ہوسکتی ہے! میرے خیال میں تھکن کو فقط منفی معنوں میں لینا انتہا پسندانہ سوچ کا نتیجہ ہے۔ ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ تھکن میں مبتلا ہونا مایوسی یا خواہش کے پھینکے ہوئے سنہری جال سے بچ نکلنے کی ایک مثبت کاوش ہے، وہ یوں کہ تھکن کی گرفت میں آنے کے بعد وقتی طور پر سہی ہم دنیاوی مفادات اور دیگر ترغیبات میں دلچسپی لینا ترک کر دیتے ہیں، بالخصوص ذہنی طور پر تھکا ہوا شخص گویا سلوک کی کسی افضل تر منزل کی جانب گامزن دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس حوالے سے گوتم واقعی ایک تھکا ماندہ شخص تھا سو اُس نے خواہش کی زائیدہ تھکن کے حِصار سے نجات پانے کے لئے جنگل کی راہ پکڑی تھی۔

اکثر و بیشتر کاہلی اور تھکن میں واضح تمیز نہیں کی جاتی۔ بعض دفعہ تو ان دونوں کو آپس میں کچھ یوں خلط ملط کر دیا جاتا ہے کہ ان کا باہمی تفاوت ہی مٹ جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں میں فرق واضح ہے، وہ یوں کہ تھکن میں ''تکمیلیت'' کا احساس مضمر ہوتا

ہے۔عموماً یہ کسی کام یا ذمے داری کو انجام دینے کے بعد غلبہ پاتی ہے۔اس کے برعکس کاہلی ایک طرح سے ''بے عملی'' کا واضح ثبوت ہے۔گویا کاہلی کسی فریضہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی استعداد رکھنے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہ ہونے کی حالت کو کہتے ہیں،مگر اسے کیا کہیے کہ سرکاری ملازم کا ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنا اس کی بے عملی متصور کیا جاتا ہے،یعنی یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ وہ اب ذہنی اور جسمانی دونوں صلاحیتوں کے انتشار کے باعث تھکن کا شکار ہو چکا ہے،لہٰذا اسے باعزت طور پر ملازمت کی ذمّہ داریوں سے بری کر دیا جائے۔نتیجتاً اچھا بھلا اہل کار بے کار ہو جاتا ہے اور یہ بے کاری اسے واقعی تھکن میں مبتلا کر دیتی ہے۔بالفرض اگر کسی وجہ سے وہ تھکن کے آگے سرنگوں ہونے سے انکار کر دے تو ایسے میں دوست احباب اور عزیز رشتہ دار اس کی اچھی بھلی صحت کی خرابی کا تذکرہ اس دردمندانہ..... لہجے میں کرتے رہتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسلسل تھکن کا وظیفہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے،یعنی تھکن میں مگن رہنے کے سوا اس کے پاس کہنے سننے کے لئے کچھ بچتا ہی نہیں۔ان حالات میں بعض دفعہ اولاد کی غیر ضروری ''خدمت گزاری'' بھی وقت سے پہلے ہی اُسے مختلف النّوع امراض کا چلتا پھرتا اشتہار بنا دیتی ہے تاہم اس سب کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تھکن بظاہر بدن کو تو مضمحل کرتی ہے،مگر روحانی طور پر اسے چاق و چوبند کر دیتی ہے۔بظاہر تھکن میں مبتلا شخص مراقبے کی سی کیفیت میں کسی چارپائی، پلنگ پر لیٹا یا آرم چیئر پر بیٹھا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر بباطن وہ پوری طرح بیدار ہوتا ہے۔چنانچہ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ کم از کم فلاسفر بننے کے لئے تھکن سے فیض یاب ہونا بہت ضروری ہے۔

جہاں تک تاریخ کی بات ہے تو اس کی زبانی یہی سنتے آئے ہیں کہ جب کوئی قوم تھکن کی زَد پر آئی تو اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔شاید اسی لئے ماضی بعید کے حکمران، ہمسایہ ممالک پر لشکر کشی کرنے پر ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے اور اکثر اپنی اور دوسروں کی تھکن کو شکستِ فاش دینے میں بھی کامیاب ہو جاتے تھے۔دوسری طرف آج کی مغربی تہذیب کا بھی یہی حال ہے۔ہر چند کہ اس نے چہار دانگ ہنگامۂ محشر برپا کر رکھا ہے،مگر اس کے باوجود تھکن کے نام سے ہی اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔مغربی تہذیب کی پروردہ سوچ تھکن کو اپنی غیر معمولی اور غیر فطری رفتار کے راستے کا سنگِ گراں سمجھتے ہوئے اس کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور طرح طرح کے ٹانکوں اور ٹوٹکوں، ورزشوں اور مشقوں کے ذریعے اِسے چت کر دینا چاہتی ہے اس کے برعکس مشرقی تہذیب تھکن کو روحانی سرشاری یا بے خودی کا پَرتو گردانتی ہے اور بعض دفعہ اسے کھوجتی ہوئی غاروں، گپھاؤں، خانقاہوں اور حُجروں تک جا پہنچتی ہے۔

وہ لوگ جو تھکن کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں بالآخر کسی نہ کسی نشے کے عادی ضرور ہو جاتے ہیں،وجہ یہ کہ نشہ آور اشیاء کا استعمال بھی عارضی طور پر خود کو تھکن سے مانوس کرنے کی کوشش کے مترادف ہے،تاکہ کچھ وقت اپنے ساتھ گزارا جا سکے۔اِس زاویے سے دیکھیں تو خیال آتا ہے کہ مغربی دنیا میں ڈرگز یا منشّیات کے استعمال کا بڑھتا ہوا رجحان کہیں ان کی حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی رفتار کے خلاف ایک احتجاج کی صورت تو نہیں ہے!شاید اسی لئے مجھے بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے مغربی تہذیب واقعی روحانی طور پر مفلوک الحال ہو چکی ہے یہی وجہ ہے کہ قدرتی تھکن سے لطف اندوز ہونے کے بجائے وہ مصنوعی نشہ آور طریقوں

سے خود کو تھکن آشنا کر کے روحانی کیف وانبساط حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

آپ شاید مجھ سے اتفاق کریں کہ ہمہ وقت چاق و چوبند اور چوکس رہنا کسی سزا سے کم نہیں ہے۔ جدید دنیا بھی شاید سسی فِس کی طرح کام کی بھاری بھرکم چٹان کو مسلسل ڈھوتے چلے جانے کی سزا بھگت رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں تھکن کی ہلکی ہلکی آنچ میں سلگتے رہنا ایک ایسا، کیف زا روحانی تجربہ ہے جو تھکن میں مبتلا شخص کو تمام دنیاوی آلائشوں سے محفوظ کر دیتا ہے۔ مگر اس سچائی سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ تھکن ایک طرح کا سپیڈ بریکر ہے جو حد سے مُتجاوَز رفتار کو نہ صرف غیر معمولی طور پر کم کر دیتا ہے بلکہ اس بات کا احساس بھی دلاتا ہے کہ غیر معمولی تیز رفتاری سے نہ صرف دوسروں کی بلکہ کبھی کبھی اپنی جانِ عزیز کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ تاہم رفتار کم نہ کرنے کی صورت میں وہ ابدی پتھریلی تھکن کے دیار میں داخل ہوسکتا ہے۔ پتھریلی اس لئے کہ پتھر سے زیادہ تھکی ہوئی کوئی اور شے نہیں ہے اور پتھر دل اصلاً ''موبمو چور اور عضو عضو نڈھال'' شے ہے اَور اسے آدمی کا نام نہ ہی دیں تو اچھا ہے۔

◆◆◆

''تخلیق'' کراچی میں مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہو گا

اکادمی بازیافت

M-17، کتاب مارکیٹ، سٹریٹ نمبر 3، اردو بازار، کراچی۔74200 (فون:021-32751324)

دانش کدہ

زہرا سکوائر، بلاک نمبر 6، گلشنِ اقبال، راشد منہاس روڈ، کراچی۔75300

(فون:021-34966138)

میری کہانی

.....4.....

فرخندہ لودھی

قرآن شریف کا سبق سُنا کر گھر لوٹی ہوں۔سب کے چہرے اُترے ہوئے ہیں۔اماں رو رہی ہیں۔پچھلے دالان کی اندھیری فضا سے بہنوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں، دن کا اُجالا سمٹتا جا رہا ہے۔کوئی بھی کھانا کھانے کی طرف متوجہ نہیں ہُوا۔ابّا غنودگی کے عالم میں حقّہ پی رہے ہیں۔میری آنکھیں، کان اور احساس کسی حادثے کا ادراک کر رہے ہیں۔میں اماں سے پوچھتی ہوں:

''امّاں کیا ہُوا؟''

''کچھ نہیں.....''

وہ روئے جاتی ہیں۔ابّا نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا ہے۔میری آنکھیں جھٹپٹے میں جانے کیا تلاش کر رہی ہیں.....کوئی جواب!

شام ہونے تک مجھے جانے کیسے پتا چل چکا ہے کہ ابّا اور اماں کی زبردست لڑائی ہوئی ہے اور انہوں نے اماں اور دونوں بڑی بہنوں کو پیٹا بھی ہے۔رات کا کھانا نہیں پکا۔گھر میں آٹا نہیں تھا۔پیسے نہیں تھے اور ابّا کی افیون بھی ختم تھی۔

دوسرا دن بھی فاقے میں گزر گیا۔منہ میں کھیل تک اُڑ کر نہیں گئی۔باسی روٹیوں کے سوکھے ٹکڑے تو چار روز پہلے پکا کر کھائے جا چکے تھے۔ہائے وہ کتنے مزیدار تھے، نمکیلے۔یاد چلی آ رہی ہے۔

پیاز اور کریلے پکے ہیں۔میرا چھوٹا بھائی اخلاق احمد میرے سامنے سے روٹی اُٹھا کر لے گیا ہے۔میں نے چیخ کر امّاں سے شکایت کی ہے۔''ہائے میری روٹی۔امّاں! خالق لے گیا۔واپس لے دو۔''اماں پچکار کر خاموش رہنے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ اصل میں یہ خواب تھا۔میں فاقے کی کمزوری اور غنودگی کے عالم میں روٹی کا خواب دیکھتی ہوئی اٹھی تھی۔

امّاں کے چہرے کے تاثّرات کیا تھے، مجھے یاد نہیں۔مگر نہایت افسردگی اور نقاہت کے ساتھ وہ ڈولتی ہوئی پچھلی کوٹھڑی میں گئیں جب لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں کشمش کے چند دانے اور بادام تھے۔انہوں نے نہایت رازدارانہ طریقے سے میری مٹھی میں رکھ دئے اور کہا۔''چپکے سے کھا لو۔بھائی کو پتا نہ چلے۔''بھلا بھائی کو کیوں پتا نہ چلے؟ وہ بھی تو بھوکا ہے۔امّاں کا خیال ہے کہ ابّا اُسے بازار سے کچھ نہ کچھ ضرور کھلا دیتے ہیں۔

گھر کے ایک طرف امام باڑے کی دیوار ہے جسے لوگ ''بغیچی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔امام باڑہ تو کیا، قبرستان

ہے۔اس میں امام باڑے کے نگران کے بزرگوں اور بچوں کی قبریں ہیں۔مجلیس ،قوالیاں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔دور دور سے قوال اور ذاکر آتے ہیں اور رات رات بھر محفل جمی رہتی ہے۔ذوالجناح کو باغیچی سے باہر لے جا کر گھمانے کی اجازت نہیں۔اندر ہی قبروں کے گرد سات چکر لگا کر،شیعہ حضرات ماتم کرتے رہتے ہیں۔

سیاہ لباس میں ملبوس گوری عورتوں کے ہیولے ذہن میں اُبھرے چلے آ رہے ہیں۔ادھیڑ عمر عورت دیوار کے ساتھ ایک ٹانگ پر کھڑی تسبیح پھیر رہی ہے۔مٹی کے پیالوں میں شوربا اور ہاتھوں میں روٹیاں لیے لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ذرا پرے چھپر کے نیچے دو آدمی بڑی بڑی پراتوں میں کھڑے، پاؤں سے آٹا گوندھ رہے ہیں۔میرے ذہن میں ایک ہی خیال ہے اور یہ خیال بار بار ستا رہا ہے۔اماں کہتی ہیں،''آٹا زمین پر مت گراؤ۔گناہ ہوتا ہے۔'' یہ آدمی پاؤں سے روندھ رہے ہیں۔کیوں؟ آخر کیوں؟.....آٹا گندا ہو رہا ہے۔چھی۔چھی۔چھی۔

باغیچی والوں نے ہمارے گھر چاولوں کا بڑا طباق، روٹیاں اور شوربا بھیجا ہے۔ڈیوڑھی کے پاس کھڑی امّاں محلے کے بچوں میں دودھ کی چھاچھ تقسیم کر رہی ہیں۔جو جتنی پی سکے، پی لے۔

ہماری چھت پر اتنی بہت سی عورتیں ذوالجناح اور ماتم دیکھنے کی غرض سے جمع ہو گئی ہیں کہ اماں کو چھت کی کمزوری کا شدید احساس ہو رہا ہے۔کنڈی چڑھائے رکھنے کے باوجود عورتوں کے غول کے غول دونوں چھتوں پر پھر رہے ہیں۔بے دھڑک پھرتے ہیں۔

عورتوں نے بھاری کپڑے اور زیورات پہن رکھے ہیں۔وہ ''میلہ'' دیکھنے آئی ہیں۔بھائی غیاث کے لگائے ہوئے گل عباسی کے پودوں میں بے شمار سرخ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ان میں خوشبو نہیں۔توڑو تو فوراً مرجھا جاتے ہیں۔باغیچی میں اُگے ہوئے شیشم کے پیڑوں کی شاخیں ہمارے گھر کی چھت پر جھک آئی ہیں ان کے دھان جیسے پھولوں کی بے معلوم خوشبو ہر وقت پھیلی رہتی ہے۔

ہمارے پڑوس میں ترکھانوں کا گھر ہے اور اس سے پرے نانا جان کا۔پڑوسی عورتیں.....دیورانی اور جٹھانی.....اکثر آپس میں لڑتی رہتی ہیں۔ان کے میاں ان کی پٹائی بھی کرتے ہیں۔دیورانی بھولی بھالی خوبصورت عورت ہے جس کو سب لوگ جان بی بی کے نام سے جانتے ہیں۔

اُس کے بھرے بھرے گورے گداز جسم کا احساس مجھے اس وقت بھی ہے، ترشے ہوئے مگر موٹے ہونٹوں پر خوب تیز رنگ کی سرخی لگاتی ہے اور یہ سرخی تیار کرنے کے لیے وہ محلّہ بھر میں مشہور ہے۔عورتیں سفارشیں کر کے اس سے بنواتی ہیں۔

اس کے ہاتھوں کی مہندی اور کٹورا سی آنکھوں میں کاجل کی ڈور سے ہم بچے بھی غافل نہیں۔اُسے سجنے سنورنے کا بہت شوق ہے۔کہیں کوئی تقریب ہوئی جھٹ سے ہار سنگھار کر کے ٹیکا جھمکے اور گلے میں موٹا کنٹھا پہن لیتی ہے۔کپڑے بے شک پرانے اور ملگجے ہوں دوپٹہ نیا رنگین اور چمکدار پہن کر یوں دکھائی دیتی ہے جیسے ابھی ابھی ڈولی سے نکلی ہوں حالانکہ چار بچوں کی ماں ہے۔ صبح سویرے جوڑے پر موتیوں کے ہار لپیٹے کبھی اس ہمسائی کو سلام کیا کبھی اس کا حال پوچھا۔ہر وقت چہکتی رہتی ہے۔اماں

کو بڑی پسند ہے اس لیے کہ ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔

جمعرات کی رات ہے۔ گرمی زوروں پر ہے۔ ہم چھوٹے بچے اور بھائی اوپر چھت پر سوئے ہوئے ہیں۔ اماں اور دونوں بڑی بہنیں نیچے صحن میں ہیں۔ جانے بند کمروں کے اندر کیا مسلسل شور ہے کہ صحن میں سوئی اماں اور بہنیں جاگ اُٹھی ہیں۔ ان کی باتوں سے ہم سب کی نیند ٹوٹ گئی ہے۔ ابّا کہیں دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی دروازہ کھول کر اندر جھانکنے کی جسارت نہیں کرتا۔ اپنی اپنی چارپائیوں پر خوفزدہ بیٹھے ہیں۔

پچھلی کوٹھڑی میں بھائی غیاث کے کھیلنے کی کانچ کی گولیاں ایک صندوقچی میں رکھی تھیں۔ یوں آواز آتی ہے جیسے کوئی ان کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ کبھی ایک دم ساری گولیاں زمین پر بکھیر دیتا ہے اور کبھی ایک ایک کر کے صندوقچی میں ڈالتا جاتا ہے۔ یہ کھیل کافی دیر تک جاری رہا۔ نہ معلوم میری آنکھ دوبارہ کب لگی۔

امّاں اکثر بتایا کرتی تھیں کہ لوگوں کا خیال ہے ہماری پچھلی کوٹھڑی میں کوئی بزرگ رہتے ہیں لیکن گھر والوں میں سے امّاں کے سوا کسی کو وہ بزرگ نظر نہیں آئے۔

سردیوں کا آغاز ہے۔ ابا جی گھر کے تمام افراد کے لیے ریڈی میڈ سویٹر لے کر آئے ہیں۔ بڑی آپائیں اپنی اپنی مرضی کے سویٹر چُن رہی ہیں۔

آج ابّا جی موسم سرما کے لیے چینی کے برتن خرید کر لائے ہیں۔ پرچیں، پیالیاں اور بڑے پیالے، خوبصورت نقش و نگار والے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر دل اپنے آپ خوش ہُوا جاتا ہے۔ اماں چھونے اور ہاتھ لگانے تو دیتی ہیں مگر کافی دیر تک کے لیے ہاتھوں میں رہنے نہیں دیتیں۔

بڑی آپا کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ مہمان آتے رہتے ہیں اور ان کی خاطر مدارات کے لیے ہر آدمی مصروف نظر آتا ہے۔ اچھے کھانے پکتے ہیں۔ مٹھائیاں منگائی جاتی ہیں۔ موسم کے پھل آتے ہیں۔

امّاں اور ابّا کو آپس میں بیٹھ کر صلاح مشورہ کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ اماں سہمی سہمی اور دور دور رہتی ہیں۔ کچھ انہی دنوں پتا چلا ہے کہ ہماری گاؤں والی آبائی زمین بِک گئی ہے۔

امّاں بیمار ہیں۔ رات بھر کھانستی رہتی ہیں۔ گھریلو ٹوٹکوں سے کوئی فایدہ نہیں ہُوا۔ پیسے نہیں ہیں کہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے۔ ایک گھر چھوڑ کر ماموں رہتے ہیں مگر کبھی اپنی بہن کی خبر لینے نہیں آئے۔

میں باہر سے کھیل کود کر واپس آئی ہوں۔ پتا چلا ہے ماموں آئے تھے اور کچھ پھل وغیرہ بھی دے گئے ہیں (مگر آج سوچتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اماں نے کہیں اپنے پاس سے چھپا کر رکھے ہوئے پیسوں سے فروٹ منگوایا ہوگا) نہ معلوم کتنا دل چاہتا ہوگا کھانے کو مگر وہ سارے کا سارا تو ہمیں دے دیتی ہیں۔ کون کون سے پھل تھے؟ بس کیلا یاد ہے۔''

◆◆◆

(جاری ہے)

نکلے ہوئے جنت سے

.....8.....

عزیز میرٹھی

راگ رنگ

تیسرے دن میں صبح سویرے مسافر خانے سے نکلا، ایرانی کے ہوٹل سے روایتی ناشتہ، بھنا قیمہ سلائس اور پوڈر کی چائے سے کیا۔ اور دو تین بیڑیاں پھونک کر ماہم میں لیڈی جمشید جی روڈ پر واقع گلشن محل میں جا پہنچا، تنویر نقوی مل گیا، لیکن گفتگو کھڑے کھڑے ہوئی کیونکہ لاہور سے تنویر کی والدہ اور دوسرے رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ فی الحال مسافر خانے میں قیام ہے۔ لیکن وہاں ایک ماہ سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔ تنویر نے مجھے تسلی دی اور کہا انشا اللہ جلد ہی کوئی مناسب انتظام ہو جائے گا۔ تنویر کو خدا حافظ کہہ کر میں پھر مسافر خانے میں آ گیا اور ''راگ رنگ'' کا مسودہ لے کر کسی پبلشر سے معاملہ کرنے کا ارادہ کر کے باہر نکلا، بمبئی میں کوئی پبلشر میرا واقف نہ تھا، بلکہ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اتنے بڑے شہر میں کون کون سے پبلشر ہیں، اور اُن کے پتے کیا ہیں۔ ایک بار محمد علی روڈ سے گذرتے ہوئے تاج کمپنی کا شوروم نظر پڑا تھا، میں اللہ کا نام لے کر اسی طرف چل پڑا۔ تاج کمپنی کے دفتر میں ایک باریش صاحب سے اپنا مدعا بڑے سلیقے سے بیان کیا اور ''راگ رنگ'' کا قلمی نسخہ اُسے دکھایا۔ اس نے ورق اُلٹ کر دو چار گیت سرسری طور پر پڑھے اور مسودہ لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''ہم صرف قرآن مجید اور دینی مذہبی کتب شائع کرتے ہیں، کسی اور کو دکھایئے'' مزید کچھ کہنا بیکار تھا۔ میں شوروم سے باہر نکلا اور مایوسی کے عالم میں سر جھکائے فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا نہ جانے لوگوں کی کتابیں کس طرح چھپ جاتی ہیں؟ مشہور و معروف ادیبوں، شاعروں کی بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ ممکن ہے اُن سے خود پبلشر مطالبہ کرتے ہوں۔ لیکن بے شمار ایسی کتب بھی نظر سے گذری تھیں جن کے مصنفوں کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ اکثر کتابوں کے ''حرفِ اوّلین'' میں یہ بھی لکھا دیکھا تھا کہ دوستوں کے اصرار پر زیورِ طبع سے آراستہ کی جا رہی ہیں۔ مجھ سے کسی دوست نے بھی اصرار نہیں کیا۔ یہ تو میرا ذاتی شوق اور ضرورت تھی، جن غیر معروف ادیبوں، شاعروں نے یہ جرأت کی کہ گھر پھونک کر تماشہ دیکھا یعنی اپنی کتاب اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے چھپوائی، ان کی تخلیقات کو میں نے فٹ پاتھ پر کوڑیوں کے مول بکتے دیکھا یا پنساریوں کو ان کے اوراق میں نمک مرچ کی پڑیاں باندھتے پایا۔

اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ آپ کو بھائی عبدالحمید نظامی نے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی لگا کر جناب حنیف رامے کے زیر اہتمام، سستی لائبریری میں اپنے افسانوں کا مجموعہ ''چاند روشن نہیں ہے'' شائع کرایا۔ ایک ہزار میں سے چند کاپیاں رامے صاحب نے برائے فروخت اپنی دوکان مکتبہ جدید پر رکھ لیں کہ بکنے کے بعد کمیشن وضع کر کے رقم بھائی کو دے دی جائے گی۔ باقی کتابوں کا انبار ریڑھے پر لاد کر وہ گھر لے آیا۔ اور کمرے میں دیوار کے ساتھ فرش سے چھت تک چن دیں۔ کچھ دوست احباب میں مفت تقسیم ہو گئیں۔ کچھ سیل کی نذر ہو گئیں۔ باقیوں کو کیڑے کھا گئے۔ نادان بھائی نے شہرت پائی نہ کوڑی ہاتھ آئی۔ چونکہ تخلیق اور تجارت، کتابیں تصنیف کرنا اور کتابوں کا کاروبار کرنا دو بالکل مختلف کام ہیں۔ نہ ہر شاعر تاجر ہو سکتا ہے نہ ہر لکھاری کاروباری، اسی لئے میں نے آج تک اپنی کوئی کتاب خود شائع کرنے کی حماقت نہیں کی۔ اگرچہ میرے احمق ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر میں اپنی تخلیقات کو کتابی شکل میں شائع کرتا تو اب تک کم از کم نو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہوتے۔

1۔ غزلیات
2۔ قطعات
3۔ گیت ''رس رنگ''
4۔ گیت۔ ''پیار کے جلتے پھول''
5۔ مثنوی طرزِ نو ''نور و ظلمت''
6۔ ناول۔ ''پہلی نظر''
7۔ ناول۔ ''چاند رات''
8۔ خودنوشت سوانح حیات
9۔ ناول۔ ''دل لگی سے دیوانگی تک''

صرف ایک ناول ''دل لگی سے دیوانگی تک'' 2007ء میں معمولی معاوضے پر خزینۂ علم و ادب، اردو بازار لاہور نے شائع کیا تھا۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ابھی تو میں اپنے گیتوں کا مجموعہ ''راگ رنگ'' بغل میں دبائے بمبئی کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ ''خواہاں نہیں واں کوئی اس جنسِ گراں کا۔'' میری عمر اور تجربہ ہی کیا تھا۔ نہ دیکھنے ہی میں کوئی لائق توجہ شخصیت تھی۔ بہر حال راہوں کی خاک دھول اڑاتے، کتابوں کی ایک بہت بڑی دکان میں داخل ہوا۔ گدی پر بیٹھے مالک کی طرف توجہ دیئے بغیر آگے بڑھ کر شیلفوں میں چنی ہوئی کتابیں دیکھنے لگا۔ ایک تو اس لئے کہ آغازِ گفتگو کے لیئے سوچنے کا وقت مل جائے، دوسرے یہ جائزہ لوں کہ یہ کس قسم کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ وہاں کتابیں تقریباً ہر موضوع پر موجود تھیں۔ ایک شیلف میں مجھے بہزاد لکھنوی، آرزو لکھنوی، میراجی، سلام مچھلی شہری اور کچھ دوسرے گیت نگاروں کے مجموعے نظر آئے، جن سے اُمید بندھی کہ شاید یہاں کام بن جائے، کم از کم یہ جواب تو نہیں ملے گا کہ ہم گیت شائع نہیں کرتے۔ اِدھر اُدھر سے چند کتابیں اور دیکھنے کے بعد میں واپس پلٹا اور کاؤنٹر کے قریب سے گزرنے لگا تو تسبیح پھیرتے بزرگ نے پوچھا۔

''کون سی کتاب چاہیئے جناب؟''

میں نے کہا ''مجھے کوئی کتاب نہیں خریدنی بزرگو! میں تو خود اپنی ایک کتاب کا سودا کرنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا! آپ کی تعریف؟''

''میرا نام عزیز میرٹھی ہے۔''

ظاہر ہے وہ میرے نام سے واقف نہ تھا۔اس لئے اس کے سپاٹ چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہوا۔ پھر بھی سرسری طور پر اس نے پوچھ لیا۔

''کتاب کس موضوع پر ہے؟''

''گیتوں کا مجموعہ ہے۔''

''گیتوں کا مجموعہ.....!''اس نے کچھ ناگوار انداز میں ناک چڑھائی اور کہا۔

''شاعری کی آج کل کچھ زیادہ کھپت نہیں،لوگ پڑھتے ہی نہیں۔کوئی ناول یا افسانوں کا مجموعہ ہوتا تو.....''

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا''اس مجموعے کے بیشتر گیت ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو کر کافی مقبول ہو چکے ہیں۔معیاری ادبی رسائل میں شائع ہو کر اہلِ ذوق سے داد وصول کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ کچھ نئے گیتوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے پیش لفظ تحریر فرمایا ہے۔میں چاہتا تو نامی گرامی ادیبوں، دانشوروں اور نقادوں سے اس پر بہت کچھ لکھوا سکتا تھا،لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے،''مُشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔''لاہور کے ایک پبلشر نے اسے شائع کرنے میں دلچسپی لی تھی لیکن مجھے ان کی شرائط.....''

میرے طول کلام سے اُکتا کر بزرگ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ذرا دکھایئے تو.....''

میں نے مسودہ ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں تھما دیا۔وہ کچھ دیر تک ورق اُلٹ کر کہیں کہیں سے دیکھتے رہے۔

قلمی نسخہ میں نے اتنا خوش خط تحریر کیا تھا کہ کتابت کا گمان گزرتا تھا،گیت جیسے بھی ہوں لیکن الفاظ صفحہ قرطاس پر موتیوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔خوبصورت بیل بوٹوں اور سرخ سبز، نیلے، پیلے حاشیوں سے بھی اوراق کو مزّین کیا گیا تھا،مسودے کے ڈیڑھ سو صفحات پر کوئی ایک سو گیت درج تھے۔چیدہ چیدہ گیت پڑھنے کے بعد وہ دیر تک مسودے کو ہاتھ میں لئے کچھ سوچتے رہے۔اور اس طرح تولتے رہے، جیسے سنار زیور کے وزن کا اندازہ لگاتا ہے اور میرا دل امید و بیم کے بحرِ تلاطم خیز میں ڈوبتا اُبھرتا رہا۔آخر انہوں نے مہر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے میرٹھی صاحب! فی الحال تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔آپ چاہیں تو مسودے کو اپنے ادارتی عملے کے سپرد کر دیتا ہوں،اُن کی رائے کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں حضرت،آپ مسودہ دیکھ لیں۔''

''تو ٹھیک ہے۔آپ ایک ہفتے کے بعد تشریف لایئے۔''

انہوں نے مسودہ میز کی دراز میں رکھ لیا۔ اور میں اپنے مسودے کو اور ان بزرگ کو فی امان اللہ کہہ کر ٹرام میں سوار ہو گیا۔ ابھی میری عمر ہی کیا تھی۔ بازارِ زندگی کے سرد و گرم، اُتار چڑھاؤ اور خرید و فروخت کا تجربہ ذرا بھی نہ تھا۔ بس ایک جذبہ، ایک شوق ایک اندھی لگن اور ایک امید تھی کہ مجھے برگ آوارہ کی طرح اڑائے پھرتی۔ دل پر جو ناکامی اور مایوسی کا بوجھ تھا کافی کم ہو گیا۔ کانوں میں مسلسل ایک غیبی آواز آ رہی تھی۔ عزیز! خوش ہو جاؤ، تمہاری مشکل آسان ہو گئی، تمہیں اپنی برسوں کی محنت کا صلہ ملنے ہی والا ہے۔'' یقین اور اعتماد کے شفاف آسمان پر، منفی سوچ اب صرف بادل کے ایک خفیف اور حقیر سے ٹکڑے کی طرح رہ گئی تھی۔ پھر بھی یہ ایک ہفتہ برسوں پر محیط ہو گیا۔ اس دوران کسی اور کام کی طرف دھیان نہ دے سکا، بس ایک ایک کر کے دن گنتا رہا اور ساتواں دن مجھے کشاں کشاں کتابوں کی دوکان پر لے آیا۔ بزرگ بڑے التفات سے پیش آئے۔ بڑی خوش روئی سے تشریف رکھنے کو کہا۔ پہلے گرم چائے اور بسکٹوں سے کام و دہن کو تواضع کی پھر یہ خوش خبری سنا کر کانوں میں رس گھولا۔

''میر ٹھی صاحب! مبارک ہو، آپ کا مسودہ پسند کر لیا گیا ہے، اب فرمائیے آپ کی شرائط کیا ہیں؟''

اُن کی زبان سے یہ مبارک کلمات سن کر مجھ پر فرطِ مسرت سے جو کیفیت طاری ہوئی اس کا لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں۔ میں نے مشکل سے خود کو سنبھالا اور رُک رُک کر کہا۔

''دیکھئے قبلہ اس سے پہلے میری کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نہیں جانتا کہ اس مجموعے کی کیا قدر و قیمت ہے۔ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مٹی کی قیمت کمہار اور جوہر کی قدر جوہری ہی جانتا ہے۔'' اس پر وہ مسکرائے، اس مسکراہٹ میں داد کا ایک انداز پنہاں تھا، پھر انہوں نے ارشاد فرمایا۔

''میر ٹھی صاحب! ہم عام طور پر مشہور ادیبوں کو چار روپے فی صفحہ کے حساب سے ادائیگی کرتے ہیں، آپ کی کتاب کا حجم زیادہ سے زیادہ ایک سو صفحات ہو گا۔ کیا خیال ہے؟''

''جی! بجا فرمایا۔ اتنا ہی ہو گا۔'' میں فیصلہ کن مرحلے پر پہنچنے کے لئے بیتاب تھا۔

''اس مجموعے کے ہم آپ کو..... ڈھائی سو روپے پیش کر سکتے ہیں۔ کتاب شائع ہونے پر پچیس کاپیاں آپ کو بلا قیمت الگ سے دی جائیں گی۔ قبول ہو تو بسم اللہ ورنہ آپ کی امانت آپ کو مبارک ہو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے میز پر رکھا مسودہ کھسکا کر میرے قریب کر دیا۔ دو سو پچاس روپے، میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ میرے لئے یہ خطیر رقم اس وقت ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ میں نے اس پیشکش کو اپنی توقع سے کہیں زیادہ پایا۔ پیسوں سے زیادہ خوشی مجھے اپنی کتاب کے شائع ہونے کی تھی، کیونکہ یہ کتاب مجھے فلم نگری سے متعارف کرانے میں بڑی سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ ہدایت کاروں، اداکاروں، موسیقاروں اور فلم سازوں سے راہ و رسم بڑھانے میں بھی بہترین معاون کا کردار ادا کر سکتی تھی۔ تنویر نقوی کو بھی فلمی دنیا سے روشناس کرانے میں اس کے گیت اور قطعات کے مجموعے نے اس کی بڑی مدد کی تھی۔ سچ تو یہ کہ میں یہاں تک سوچے ہوئے تھا کہ اگر وہ بلا معاوضہ بھی کتاب چھاپنے پر تیار ہو گئے تو میں انکار نہ کروں گا اور کچھ نہ سہی صاحب

دیوان تو کہلاؤں گا۔ پھر مجھے یہ بھی علم تھا کہ تنویر نقوی جیسے منفرد نغمہ نگار کے مجموعے ''سنہرے سپنے'' کے جملہ حقوق لاہور کے ایک ہندو پبلشر نے صرف پندرہ روپے میں خریدے تھے۔ جبکہ مجھے تو دوسو پچاس روپے مل رہے تھے جو غریب الوطنی میں چند روز کے لئے ہی سہی امیرانہ شان محسوس کرنے کے لئے کچھ کم نہ تھے۔ پھر بھی میں نے اس توقع پر، اپنے مسودے پر ہاتھ رکھ کر انہیں جواب دینے میں توقف کیا کہ ممکن ہے وہ مجھے رضامند نہ پا کر رقم میں کچھ اضافہ کر دیں۔

''کیا سوچنے لگے عزیز صاحب؟'' مجھے خاموش پا کر بزرگ صورت نے پوچھا۔

''جی!..... کچھ نہیں۔''

''تو پھر جلدی بتایئے مجھے پریس جانا ہے؟''

''لالچ بُری بلا ہے عزیز! ہاں کہہ دو۔'' مجھے ضمیر نے بُری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ اور ایک حکایت یاد دلائی جس میں ایک قسمت کا مارا، مفلوک الحال، تنگ دست ایک درویش خدا دوست سے، اپنی ایک آنکھ میں سلیمانی سرمہ لگوا کر زیرِ زمین چھپے اتنے بڑے خزانے کو دیکھنے کے قابل ہو گیا جسے دونوں ہاتھوں سے لٹاتا تو بھی اس کی سات پشتوں کے لئے کافی تھا۔ مگر لالچ میں آ کر دوسری آنکھ میں بھی ایک سلائی پھروانے کی ضد کی۔ درویش کسی طور آمادہ نہ ہوا۔ اور اس کی منت وزاری کو ٹھکرا کر آگے بڑھ گیا۔ غریب آدمی کو ہوس نے اندھا کر دیا، اور وہ پہلے خزانے پر ایک پتھر نشانی رکھ کر درویش کے تعاقب میں چل پڑا۔ درویش چھلاوے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر وہ ناک کی سیدھ میں قدم بڑھاتا رہا۔ سورج ڈوبا اور رات نے آ لیا۔ طویل سفر طے کرنے کے بعد اس نے چاند کی چاندنی میں درویش کو ایک چٹان کی اوٹ میں بے خبر سوتے جا لیا۔ ایک بھاری پتھر اٹھا کر اپنے محسن کے سر پر مارا اور پاش پاش کر دیا۔ جلدی جلدی درویش کی زنبیل کو ٹٹول کر سرمے دانی نکالی اور جیسے ہی سلائی اپنی دوسری آنکھ میں پھیری نیٹ اندھا ہو گیا۔ درد سے چلاتا، چیخ و پکار کرتا، گرتا پڑتا چٹانوں سے سر ٹکراتا، توبہ استغفار کرتا، خون کے آنسو بہاتا، بارگاہِ الٰہی میں دوبارہ بینائی کی دعائیں مانگتا، بھٹکتا پھرا، مگر خود کردہ را علاجے نیست۔ نہ صرف ہاتھ آئے خزانے ہاتھ سے گئے بلکہ آنکھوں سے نور بھی گیا اور ہمیشہ کے لئے اندھیروں کو اپنا مقدر بنا لیا۔ سچ ہے لالچ بُری بلا ہے۔ کسی دانشور کا قول ہے دُنیا میں بہت سے آدمی اپنی طبعی موت مرنے کی بجائے خوف و دہشت اور لالچ کا شکار ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں

میں نے فوراً حامی بھر لی اور ایک چھپے ہوئے فارم پر ''راگ رنگ'' کے جملہ حقوق دوسو پچاس روپے نقد اور طبع شدہ کتاب کی پچیس کاپیاں مفت کے عوض سلطان حسین پبلشرز اینڈ بک سیلرز کے نام فروخت کر کے دستخط ثبت کر دیئے۔ سوسو کے دو اور ایک پچاس روپے کا، تین نئے نکور کرارے نوٹ جیب میں ڈال کر میں نے ان سے دریافت کیا۔

''حضرت! یہ کتاب کب تک زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ سکے گی؟''

''دیکھو! ابھی تو بہت سے مسودوں کی کتابت جاری ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''آپ اپنا پتہ لکھا دیں، کتاب چھپنے پر آپ کو بذریعہ ڈاک مطلع کر دیا جائے گا۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گیا۔

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں تمھیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اس وقت میری خوشی کا عالم یہ تھا کہ پاؤں رکھتا کہیں پڑتا کہیں تھا۔ دل کہتا ہے اسی لمحے تمہارا دل بھی مسرّت سے جھوم اٹھا ہوگا، اور تم نے جان لیا ہوگا کہ پردیس میں مجھے کوئی خوشی میسر آئی ہے۔ میں اسی عالم کیف و سرمستی میں ڈاک خانے پہنچا۔ پچاس روپے اپنی جیب خرچ کے لئے رکھے اور اور دو سو روپے تمہیں منی آرڈر کر دیئے، تاکہ ابا کو معلوم ہو، میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ اس جنس کی بازار میں کچھ نہ کچھ قیمت ضرور ہے، جس میں گذرے وقت کے ساتھ ساتھ مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔ انشاءاللہ! منی آرڈر فارم پر یہ بھی تحریر کیا کہ اس رقم میں سے پچیس روپے اماں کو دے دیئے جائیں کہ یہ اس کے شاعر بیٹے کی کمائی ہے۔ وہ اماں کی لوریاں ہی تھیں جن کی مٹھاس اور سریلے پن نے میرے دل و دماغ میں گیت سنگیت کا بیج بویا جو نشو و نما پا کر اب ایک نخلِ ثمرور بن چکا ہے۔ (پیشتر اس کے کہ میں آگے بڑھوں، راگ رنگ کے قصے کو انجام تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔ لاہور واپس آنے کے بعد میں نے سلطان حسین پبلشرز کو اپنی کتاب کے بارے میں کئی خطوط لکھے مگر کوئی جواب نہ آیا۔ چند ماہ بعد انور بٹالوی نے بتایا کہ 1947ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں ہندو غنڈوں نے ان کی دکان اور پریس کو آگ لگا دی تھی۔ امکان غالب ہے کہ میرا مسودہ بھی طبع ہونے سے پہلے ہی نذرِ آتش ہو گیا۔ تب راکھ کریدنا لاحاصل تھا۔ صبر کر کے بیٹھ رہا۔) خیر ڈاک خانے سے نکل کر سیدھا گیٹ وے انڈیا گیا۔ اور زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار تاج ہوٹل میں لنچ کیا۔ اور فروٹ آئس کریم کھائی، پچیس روپے کھانے کا بل اور آٹھ آنے ویٹر کو ٹپ دے کر، شاداں و فرحاں گولڈ فلیک سیگرٹ کے کش لگاتا باہر نکلا۔ (جاری ہے)

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

زندگی کی بازی کو ہارنا ہی پڑتا ہے
خود کبھی انا کو بھی مارنا ہی پڑتا ہے
جن سے سو گِلے رکھنا، ان کے اِک اشارے پر
جان و دِل کو ہنس ہنس کے وارنا بھی پڑتا ہے

سفرِ شمال

.....4.....

طارق محمود

ایوّن سے نکلے تو آگے سڑک کا وجود ناپید تھا، ایک ناہموار ہچکولے کھاتا راستہ تھا جہاں سے ہماری گاڑی گزر رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک کھلا میدان دکھائی دیا۔ ڈاکٹر قیوم نے بتایا کہ اس جگہ کو پولوگراؤنڈ کہا جاتا تھا، وجہ تسمیہ کی سمجھ نہ آئی۔ پولو نامی کسی شے کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ سڑک کے کنارے ایک دراز قد غیر ملکی خاتون نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ خاتون نے چست جین اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کا چہرہ غالباً دھوپ کی مسلسل تمازت سے بھورا (Tan) ہو چکا تھا۔ کمر سے ایک سفری بیگ لٹکا رکھا تھا اور ہاتھ میں گائیڈ بک (Guide Book) تھامے ہوئی تھی۔ ''لومیرڈ'' اس نے وادی کیلاش کے حوالے سے بلند آواز سے سوال کیا۔ ''میں بڑی دیر سے جیپ کی سواری کی منتظر کھڑی ہوں، مجھے لفٹ چاہیئے۔'' اُس نے ڈبل کیبن کی کھلی کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر کہا، ڈاکٹر قیوم نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات کا اشارہ کیا۔ وہ خاتون پچھلی نشست پر سکڑ کر بیٹھ گئی۔ ''میرا نام اولگا (Olga) ہے۔'' وہ بتانے لگی۔ اُس کا تعلق جرمنی سے تھا۔ ہیمبرگ کے کسی ہسپتال میں ریڈیالوجسٹ تھی۔ وہ پہلی بار چترال آئی تھی۔ سیّاحت کا شوق اُسے یہاں لے آیا۔ ایوّن تک تو پہنچ گئی۔ وہاں سے آگے سفر تو ''فورویل'' ڈرائیو پر ہی ممکن تھا۔ اس معاملے میں مخصوص جیپیں کرایے پر مِل جاتیں لیکن اُس کے لیے پہلے سے اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات کسی مسافر جیپ میں ایک آدھ نشست مل جاتی اور کبھی کبھار بھولے بھٹکے مسافر کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔

اولگا چین کا سفر کر کے دو روز قبل ہی اسلام آباد پہنچی تھی۔ وہ مسلسل گفتگو کیے جا رہی تھی۔ اُس کے پہلو میں بیٹھے دونوں ڈاکٹر صاحبان اُسے بڑی توجہ سے سُن رہے تھے اور میں اپنے خیالوں میں کھویا بیٹھا تھا۔ وہ اب اپنے پیشے کے بارے میں بات کر رہی تھی جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم اس وقت پیچ دار، ناہموار پہاڑی راستوں سے گزر رہے تھے۔ نوکدار پتھروں سے بچتے بچاتے ہولے ہولے آگے بڑھ رہے تھے۔ دائیں جانب بلند بالا پہاڑی سلسلہ تھا اور بائیں جانب گہری کھائیاں اور اُن کے درمیان .....شوریدہ چشمے تھے۔ اس تنگ راستے کو میرے دونوں ہم سفر بار بار وادی کا نام دے رہے

تھے۔ پہاڑوں کی اُٹھان سے ان سب وادیوں میں تاریکی سی پھیلنے لگتی۔ روشنی اور سورج کی کرنیں کہیں کھو چکی تھیں۔ ماحول ایک اُداس خنکی میں گھر گیا۔ ڈرائیور نے جیسے ہی ایک پہاڑی نالے کو عبور کیا ہم 'بومیر دوادی' میں داخل ہو گئے۔ گاڑی بدستور ہچکولے کھا رہی تھی، جسم سیٹ سے بار بار اچھل رہا تھا۔ ڈرائیور بڑی بے فکری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ یہ تو اُس کا معمول تھا۔ اولگا نے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا اور یہ کہہ کر ایک ویرانے میں اُتر گئی کہ وہ ٹریکنگ کرتے کرتے شام تک کیلاش وادی میں پہنچ جائے گی جہاں ایک مقامی گیسٹ ہاؤس میں اُس کی ریزرویشن ہو چکی تھی۔ اولگا یہاں پہلی بار آئی تھی لیکن ان راستوں سے بخوبی آشنا تھی، اُس نے چترال کے بارے بہت کچھ جان رکھا تھا۔

بومیر دوادی کی بکھری آبادیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ڈھلوانی کھیتوں پر مکئی کے خوشے سر اُٹھائے کھڑے تھے اور کہیں پھلدار درخت فضا میں جھول رہے تھے۔ وقفے کے بعد پہاڑ کے کٹاؤ کے ساتھ ساتھ لکڑی سے تعمیر شدہ دومنزلہ گھر دکھائی دے رہے تھے۔ راہ میں دوسری سمت سے آتی جیپ کے مسافروں کے ساتھ آمنا سامنا ہوتا تو ڈرائیور ہاتھ ہلا کر اپنا احساس دلاتے اور آگے نکل جاتے۔ ہم وادیِ کیلاش سے گزر رہے تھے میری نظر میں اُن باسیوں کی متلاشی تھیں جو کیلاش کہلاتے۔ وہ نسل اب ناپید ہوتی جا رہی تھی۔ اُن کا وجود اب محض چند وادیوں میں سکڑ چکا تھا۔ روایت تھی کہ کیلاش یونانی مہم جوؤں کی نسل کا ایک تسلسل ہے جو انہی وادیوں میں مقیم تھے۔ اُن کی تعداد اب محض چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ راستے میں کیلاش بچے جگہ جگہ کھیلتے نظر آ رہے تھے۔ سرخ و سپید رنگت، مخصوص سیاہ لباس، موتیوں سے جڑی مالائیں پہنے سر سے رنگدار لڑیاں جھول رہی تھیں۔ جگہ جگہ مسافر خانے، کمپنگ سائیٹس (Camping Sites) دکھائی دیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم مقامی ہیلتھ سنٹر میں پہنچ گئے۔ وہاں مقامی میڈیکل آفیسر ڈاکٹر ابراہیم صبح سے ہمارا منتظر تھا۔ اُس کے سٹاف میں ایک نوعمر کیلاش لڑکی بھی تھی جو مخصوص لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ یہاں بطور مڈوائف تعینات تھی۔ اُس خاتون نے بلا جھجک اپنا ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا ''میرا نام ناصرہ ہے! اُس نے تعارف کراتے ہوئے بتایا اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ دیہی مرکز میں آئے ہوئے مریضوں سے گفتگو ہوئی۔ میرے ہمراہ آئے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ادویات کے سٹاک کا جائزہ لیا اور ڈاکٹر ابراہیم کے ساتھ کچھ پیشہ ورانہ امور کے بارے میں بھی بات کی۔ علاقے میں پولیو کے انسداد کے سلسلے میں مہم کی رفتار کا جائزہ بھی لیا۔ سرکاری امور سے فارغ ہوئے تو ڈاکٹر ابراہیم نے میرے آگے انسپکشن بک رکھ دی۔ صفحات اُلٹے تو میری نظروں سے جناب مسعود الرؤف کا انسپکشن نوٹ گزرا جو کئی برس قبل صوبائی سیکرٹری صحت رہ چکے تھے۔ گزشتہ سترہ برس سے کسی اہم صوبائی سطح کے افسر کا اس طرف رُخ نہ ہوا تھا۔ انسپکشن نوٹ سے تو یہی پتہ چل رہا تھا۔

دیہی مرکز سے فارغ ہوئے تو ہم کیلاش بستی کی طرف چل دیئے۔ جھولتی سیڑھیوں سے ہو کر قریبی دومنزلہ گھر میں داخل ہوئے۔ سامنے وسیع کمرہ تھا، کشادہ کھڑکیاں تھیں جن کے پٹ کھلے تھے، ہر شے بکھری پڑی تھی۔ اس وقت چند کیلاش خواتین پیڑھیوں پر بیٹھی، قریب ہی ایک بھٹی کو ہوا دے رہی تھیں۔ فضا میں انگور کی ملی جلی خوشبو اور سڑاند رچی ہوئی تھی۔ گھر کی

خاتون اوّل نے چولہے پر ایک بند کنستر چڑھا رکھا تھا۔ کچھ کاڑھا جا رہا تھا۔ انگور کا عرق کشید ہو رہا تھا۔ کیلاشیوں کا مرغوب مشروب انگور کی شراب تیاری کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ ڈاکٹر ابراہیم بتا رہا تھا کہ اس شراب سے بسا اوقات کیلاشی خواتین بھی محظوظ ہوتیں اور مست ہو جاتیں۔ ادھیڑ عمر کی خاتون کے ساتھ کئی اور خواتین بھی بیٹھی تھیں۔ 'آپ کا نام کیا ہے' وہ خاتون شاید میری بات نہ سمجھ پائی۔ ابراہیم نے مقامی زبان میں اُسے باور کرایا تو بولی 'رحیماں'۔

کمرے میں مقامی نوادرات بکھرے پڑے تھے میں انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا، رحیماں کے قریب سے ایک خاتون اٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے آواز دے کر ڈاکٹر ابراہیم کو بلایا۔ ڈاکٹر نے مجھے اپنے ہمراہ لیا اور اب ہم اُس نیم تاریک کمرے میں مقامی دستکاری کی اشیا دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر ابراہیم یہاں کئی برسوں سے مقیم تھا۔ کیلاش اُسے اپنا سمجھتے۔ اُن کے دکھ درد کا ساتھی۔ اُس نے یہاں سے کئی بار جانے کی کوشش کی لیکن یہاں کوئی اور ڈاکٹر آنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہی اندیشہ رہتا کہ ایک بار وادی میں تبادلہ ہو گیا تو یہاں سے نکلنا محال تھا۔

کمرے میں تاریکی اور اندھیرے سے دم گھٹنے لگا، چھت پر ایک روزن سے دھوپ کی مہین لکیر چھن چھن کر آ رہی تھی۔ گہرا سانس لیا تو فضا میں رچی مخصوص باس میرے نتھنوں اور نسوں تک پھیلتی چلی گئی۔ اس کمرے کی بساند تھی یا اُس پہاڑی دوشیزہ کے وجود سے اٹھتی باس! لمحے بھر کے لئے محسوس ہوا جیسے میں بکریوں کے کسی ریوڑ میں گھر چکا تھا۔ یہ مخصوص باس بالکل ویسی ہی تھی جو چولستان میں چنن پیر کے قرب میں مٹر بچوں (مقامی چولستانی باشندے) کی آبادی میں ایک کچے گھروندے سے اُمڈی تھی۔ ایک دوشیزہ کی شادی کی تیاریوں میں ڈھولک بج رہی تھی۔ اُس صحرائی دوشیزہ نے اس پہاڑی دوشیزہ کی طرح غالباً ہفتوں سے غسل نہ کیا تھا۔ نہانا ویسے بھی معیوب ٹھہرا، نہائے وہی جس کا جسم ناپاک ہو جائے۔ اس بستی میں ایسا تصور بھلا کیوں پیدا ہوا۔ اور یوں بھی حیض کے ایام میں کیلاش دوشیزاؤں کا رہنا سہنا، کھانا پینا، برتن پانی ہر شے علیحدہ کر دی جاتی ہے۔ ہفتے بھر کے لیے گھر سے قدرے فاصلے پر علیحدگی میں وقت گزارو۔ زچگی کے ایّام میں بھی یہی احتیاط لازم تھی۔ 'چلئے یہاں سے' ڈاکٹر ابراہیم نے ہولے سے کہا 'زیادہ دیر ٹھہر گئے تو یہاں پسّو بھی پڑ سکتے ہیں۔'' ابراہیم کا انتباہ ملتے ہی میں بڑی تیزی سے اُس نیم تاریک کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس وقت ہم ایک جست خانے میں تھے۔ یہاں مقامی کیلاش جمع ہو رہے تھے۔ کسی میت کا انتظار تھا۔ مردے کو جست خانے میں رکھا جائے گا، دن رات ناچ گانے کی محفل جاری رہے گی، مہمانوں کی خاطر مدارات کی جائیں گی۔ جانے والے کو دنیا کے تفکرات سے آزادی نصیب ہوئی۔ دنیا کی قید سے رہائی مل گئی، اور اس کے بعد مسرت کے عالم میں مقامی کیلاش جام پر جام لٹاتے بڑے انہماک سے چُسکیاں لگاتے جائیں گے۔ گھنٹوں ناچیں گے۔ کئی روزہ تقریبات کے بعد مردہ جسم کو لکڑی کے تابوت میں بند کر کے قریبی قبرستان میں لے جائیں گے، اب تو مردے کو دفنا دیا جاتا ہے وگرنہ برسوں پہلے تابوت کو کھلی فضا میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

یہی تجسس مجھے کیلاشیوں کے قبرستان میں بھی لے گیا۔ تابوتوں کے ڈھکنے کھلے پائے گئے۔ استخوانی ڈھانچے۔ انسانی ہڈیاں دکھائی دیں، کسی تابوت میں کھوپڑی، کہیں کولہے کی ہڈیاں اور کسی میں دانتوں کی بتیسی بکھری پڑی تھی۔ قبرستان اور آبادی کے درمیان سڑک کا فاصلہ تھا۔ قبرستان سے لوٹتے ہوئے مجھے جرمن خاتون اولگا کا خیال گزرا جو ایک ویرانے میں اتر گئی تھی۔ اُسے کہاں جانا تھا، رات کہاں قیام کرنا تھا؟ وہ بظاہر کتنی بے فکر دکھائی دے رہی تھی! نائن الیون سے پہلے یہ خطّہ یقیناً پرامن اور محفوظ تھا، جبھی تو آبادی کی خام سڑک پر گاہے گاہے غیر ملکی سیّاح، مسافر دکھائی دے رہے تھے۔

بومیرد کی کشادہ وادی میں آبی گزرگاہوں کے ساتھ ڈھلانی کھیتوں میں پھل دار درخت اور موسمی فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ فضا میں مکئی، لوبیے کی خوشبو بکھر رہی تھی۔ قد آور سنگلاخ پہاڑ چندھیاتی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پہاڑ کے ساتھ ساتھ آبی گزرگاہیں تھیں جنھیں پتھروں کی دیوار نے سہارا رکھا تھا۔ یہ آبی نالے قریبی چشموں سے پھوٹ رہے تھے۔ اور کھیتوں کو سیراب کر رہے تھے اور ان کی سطح بتدریج بلند ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس پانی کو مخصوص سطح سے گرا کر مقامی سطح پر پن بجلی پیدا کی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر قیوم نے میری حیرت دور کرتے ہوئے بتایا کہ یہ پن بجلی اب تو کئی گھروں میں پہنچ چکی تھی۔ رات گئے کیلاشیوں کے گھر روشن ہو جاتے! اس دور افتادہ علاقے میں روایتی ذرائع سے بجلی کی فراہمی کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

ہم اس وقت دوپہر کے کھانے کے لیے کیلاش انٹرنیشنل ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں تھے۔ اس ہال کی کھڑکیاں سامنے بلند پہاڑ کی طرف کھل رہی تھیں۔ ہوٹل کے قریب سے دریا گزر رہا تھا۔ منہ زور پانی کی بھاری بھرکم چٹانوں سے ٹکرانے کی آوازیں دل دہلا رہی تھیں۔ پانی کی لہریں بار بار چٹانوں سے ٹکرا کر ایسا شور بپا کر رہی تھیں جو اس وقت یہاں کے فطری حسن کو اور بھی نکھار رہی تھیں۔ کھانے کی میز مقامی لوازمات سے سجی ہوئی تھی۔ بکرے کا گوشت، سبزی، لوبیے کا سالن، مکئی اور اخروٹ کی روٹی نے عجب لطف دیا۔ اس ملک میں کیا کچھ نہ تھا، ذائقے دار نوالے کے ساتھ مجھے کسی پشین کی سجی یاد آ رہی تھی اور کبھی چولستان میں قلعہ دراوڑ کے قریب میں رات گئے وہ ضیافت یاد آ رہی تھی جس میں میرے ہمراہ بہت سے روہیلے، مقامی لوگ بھی شامل تھے۔

سورج ڈھل رہا تھا۔ وادی کی فضاؤں سے اپنا بانکپن سمیٹ رہا تھا۔ ہر طرف نیم تاریکی کے سایے لہرانے لگے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے، میں نے اچنبھے سے ڈاکٹر ابراہیم کی طرف دیکھا۔ ''جس وقت پہاڑ کے سایے بڑھنے لگتے ہیں یوں سمجھ لیں وادی میں شام ہو جاتی ہے، یہاں کے مکین اپنا کام سمیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔'' وہ بولا ''بہت ممکن ہے جب آپ اس وادی سے نکل جائیں تو آگے دوپہر کا سماں ہو، سورج اپنی روایتی آب و تاب سے چمک رہا ہو'' ابراہیم ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

واپسی کے سفر میں بلند بالا پہاڑ کے زیرِ سایہ کبھی گھنی شام کا احساس ہوتا اور جونہی ہم اس سایے کے اثر سے نکلے تو چمکتی دھوپ نے ہماری آؤ بھگت کی۔

کوسوں دور کوہ تیرج میر کی برفانی چوٹیاں، سورج کی تیز روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔ نیرنگیٔ قدرت !اس وقت کہیں اندھیرے کا جھٹ پٹا تھا اور کہیں برف پوش تیرج میر ڈھلتے سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ تنگ وادیوں سے گزرتے پہاڑی چشمے یوں شور مچا رہے تھے جیسے کوئی نومولود کوکھ سے جنم لے کر چیخ رہا ہو۔ یہی سلسلہ کئی آبی شاخوں میں بٹا آگے بڑھ کر کسی بڑے سلسلے کا حصہ بن رہا تھا۔ ناہموار راستے کا سفر ہڈیوں کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر قیوم اور ڈاکٹر نواز اِس سفری جھمیلے سے بے نیاز خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سفر کے ہچکولے ان کیلئے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے، ان میں سے قیوم کا تعلق چترال سے اور نواز کا تعلق سوات سے تھا۔ ان پہاڑی باسیوں نے زندگی میں نجانے کتنے ایسے سفر کئے تھے۔ لواری ٹاپ سے آنا جانا اُن کی زندگی کا معمول تھا۔

اس وقت کہیں کہیں ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دوسری سمت سے جونہی کوئی گاڑی دکھائی دیتی ہمارا ڈرائیور تنگ راستے پر اپنی رفتار بتدریج کم کر لیتا، دوسری گاڑی کے لئے راستہ بناتا اور پھر گیئر بدل کر آگے نکل جاتا۔ سڑک کے ایک طرف کھائی تھی جس کے بیچوں بیچ دریا گزر رہا تھا۔ دکھائی تو نہ دیتا لیکن سنائی دے رہا تھا۔ ابراہیم نے بتایا بُھولے سے کوئی گاڑی لڑھک جائے تو مسافروں کا نام ونشان بھی نہ رہے۔ یہ سنتے ہی میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے گہری کھائی سے نظر اُٹھا کر نظریں ذرا بلند کیں۔ جیپ کا گزر ایک ایسے راستے سے ہو رہا تھا جو پہاڑ کو چیر کر بنایا گیا تھا۔ نوکدار، بھاری بھرکم چٹانیں سڑک کے اوپر اس طرح معلق تھیں جیسے بڑی خاموشی سے پیغام دے رہی ہوں کہ گزر، کیسے گزرتے ہو، آن گریں تو کیا ہوگا؟ یہ تصّور تو کھائی میں لڑھکنے کے تصور سے بھی جان کن تھا۔ بات بھی کچھ ایسی تھی، برسات اور برفباری کے دوران یہ راستہ اور بھی پُرخطر تھا، چٹانوں کی شکست وریخت، تغیر وتبدل سے پہاڑ بھی اپنا رُخ بدل لیتے، پتھریلے ٹکڑے ٹوٹ کر سڑک پر آن گرتے۔ راستہ مسدود ہو جاتا، کبھی کبھار بھولی بھٹکی سواری کسی لڑھکتی چٹان کی زد میں آ کر جان گنوا بیٹھتی۔

(جاری ہے)

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

تم سے روشن ہے زندگی میری
تم سے قائم ہے بندگی میری
اب تو تم مہربان ہو جاؤ
مان لو اب تو عاشقی میری

بیتے کل کا اِک اِک پل

.....16.....

نذیر فتح پوری (انڈیا)

کلیر شریف کے فقیر

بہت دھندلا سا عکس، بہت مبہم سی یادیں، تارِ عنکبوت کی طرح باریک مگر الجھا ہوا تصور، رمضان کی بیس تاریخ کے بعد آٹھ دس فقیروں کا ایک قافلہ بعد نمازِ عصر میری ننھیال کے محلّہ میں وارد ہوتا، ایک کے بعد ایک آگے پیچھے دروازے پر صدا لگاتے۔ سب سے آگے ہمیشہ ایک ہی فقیر ہاتھ میں بڑا سا لوہے کا چمٹا، گلے میں مختلف رنگوں کے موتیوں کی مالا، دونوں ہاتھوں میں لوہے کے پتلے پتلے کڑے، کالے رنگ کا لمبا کرتا، اسی رنگ کا تہبند، ایک ہاتھ میں کہنی تک لٹکا ہوا کشکول، دونوں ہاتھوں سے چمٹے کی دھن پر ساز بجاتے ہوئے اور مندرجہ ذیل وظیفہ پڑھتے ہوئے۔

ترا کوڑی لگے نہ دام.....لیتا کیوں نہیں مولیٰ کا نام
جپتا کیوں نہیں اللہ کا نام

قلندرانہ ترنم، فقیرانہ لہجہ، عاجزانہ صدا، جب وہ گزر جاتا تو دوسرا فقیر وہی حلیہ، وہی انداز، چمٹے کی جگی ڈفلی کی دھن پر۔ کلیر شریف والے پیر کی دہائی دیتے ہوئے۔

میرا بیڑا پار لگاؤ یار، کلیر والے سانوریا

مکمل گیت یاد نہیں۔ اس کے بعد کسی اور ساز پر تیسرا فقیر سب سے جدا وظیفہ پڑھتا ہوا آتا۔

طوطا مینا بھی گلزار
محل اٹاری بھی گلزار
بچہ بچی بھی گلزار
لوٹا سائل کا بھر دے

چراغاں چاندی کا دھر دے
دھن اور دولت بھی گلزار
طوطا مینا بھی گلزار

اس کے جانے کے بعد ایک اور فقیر آ جاتا۔ اسے گدڑی والا فقیر کہتے تھے۔ حالاں کہ اس کے بدن پر گدڑی نہیں تھی۔ وہی لباس تھا جو سابقہ تمام فقیروں کا تھا۔ لیکن اس کا وظیفہ ''گدڑی والا'' تھا۔ ابتدائی دو سطریں یاد ہیں۔

اللہ کے نام پر دے گدڑی
شال دو شالہ دے گدڑی

یہ کلیر شریف والے فقیر کہلاتے تھے۔ ایک جیسا حلیہ، قد سے اونچے، کاٹھی سے دبلے سر، دراز زلفیں کندھوں پر بکھری ہوئی، چہروں پر بے ترتیب داڑھیاں، سانولا رنگ، معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ہندو تھے یا مسلمان۔ کہاں سے آتے تھے اور کہاں جاتے تھے، کوئی پتہ نہیں، جو مل گیا، لے لیا۔ نہیں ملا تو خالی ہاتھ ہی ٹل گئے۔ کوئی تردد، کوئی ملال، کوئی شکوہ، کوئی گِلہ کچھ بھی نہیں۔ ایک صبر، ایک سکون، ایک طمانیت ان کے چہروں پر دکھائی دیتی تھی۔ میں رمضان المبارک کے بعد اپنی ننھیال میں آ جاتا، صرف ان فقیروں کو دیکھنے کے لئے، ان کا صوفیانہ ساز اور قلندرانہ انداز مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

تیرا کوڑی لگے نہ دام، لیتا کیوں نہیں مولیٰ کا نام

یہ بڑی تلقین تھی۔ ننگے پیر ریت پر خاک اڑاتے قافلوں کی طرح، راہ میں نہ کسی کانٹے کا ڈر نہ ٹھوکر کا خوف، ایک کے بعد ایک، اپنی دھن میں مگن..... یہ ایسے فقیر تھے جن کا لوگ انتظار کرتے تھے۔ بیس رمضان المبارک کے بعد اگر ان کے آنے میں تاخیر ہو جاتی تو سب ایک دوسرے سے پوچھنے لگ جاتے۔ ''ابھی فقیر نہیں آئے۔'' اب نہ وہ رہے اور نہ ان کی دعائیں رہیں، کیا زمانہ تھا دینے والے، لینے والوں کا انتظار کرتے تھے۔

فقیر آ کے دعا دے گیا چلا بھی گیا ہم ایسے لوگ اثر کی تلاش میں ہیں ابھی

آج بھی ان قلندروں کو نہیں بھولا ہوں۔ جب بھی ان کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے کسی نہ کسی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ میری شاعری میں میرا بچپن مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ ان میں قلندروں کی لے بھی ہے۔ آج بھی میرے حالات قلندروں جیسے ہیں۔ مزاج بھی کچھ کچھ قلندروں جیسا ہی ہے۔ میرے یہ شعر ایسی ہی کیفیات کے غماز ہیں۔

ہم اہلِ درد کبھی رائیگاں نہیں ہوتے
سلگتے رہتے ہیں لیکن دھواں نہیں ہوتے

جلائے پھرتی ہے دن رات میری ہستی کو
جو آگ برسرِ پیکار ہے مرے اندر

باجماعت ہم نمازِ عشق پڑھ کر آ گئے
قاضی و سیّد تو بیچارے وضو کرتے رہے

زندگی میں بہت سی نمازیں ادا ہوئیں اور بہت سی قضا ہوئیں۔ ادا وہ ہوئی جسے شرفِ قبولیت عطا ہوا۔ لیکن کس کا کون سا سجدہ قبول ہوتا ہے، یہ کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک سجدہ وہ تھا جو کربلا میں سر کٹا کر ادا کیا گیا تھا۔ آج ہم جسموں پر سر لیے پھرتے ہیں اور سجدے بھی گزارتے ہیں۔ زندگی محض نماز روزہ ہی نہیں۔ ان فرائض کی ادائیگی کے بعد بہت سے فرائض ایسے ہیں جن سے انسانیت کا بھلا ہوتا ہے۔ دوسروں کو فیض پہنچانا بھی بڑی نیکی ہے۔ یہ نیکی قلندروں کے سوا کون کر سکتا ہے۔ بابا فرید ہوں، صابر کلیری ہوں۔ بلھے شاہ ہوں، صوفی مست فقیر، نظیر، کبیر سبھوں نے یہ نیکی انجام دی ہے۔ نیکیوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ آج صوفیوں کے حلیئے بدل گئے ہیں۔ ان کے چہروں مہروں میں تبدیلی آ چکی ہے، لیکن ان کا کام نہیں بدلا، نیکی کا محافظ خدا ہے۔ نیکی خدا کی پہلی پسند ہے۔ نیکی خدا کی محبوب شے ہے۔ قلندروں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں ؎

مانگی دعا فقیر نے تو کچھ نہیں ملا
چاہا قلندروں نے تو کشکول بھر گئے

نئی غزل نے قلندر کو اس نظر سے بھی دیکھا ہے۔

رقص کرتی ہے تخیل کی دلہن
جب قلندر شعر کہتا ہے میاں

اور کبھی کبھی بہ زعم خود یہ تصور بھی ابھرنے لگتا ہے۔

نذیر اپنی حقیقت کو اب عیاں کر دو
قلندروں سے زمانہ نہیں ملا کب سے

اور یہ وسیع القلبی بھی ملاحظہ کریں جو قلندروں کے علاوہ کسی اور میں نظر نہیں آتی۔

قلندر اپنے دکھوں پر کبھی نہیں روتے
ہمیں تو جتنا بھی دکھ ہے وہ کائنات کا ہے

کائنات علامہ اقبالؔ کی نظر میں ابھی ناتمام ہے۔ اقبالؔ جیسے قلندر مزاج شاعر کو بھی کائنات اپیل کرتی ہے کیوں کہ کائنات کا دکھ ہی آدمی کو انسان بناتا ہے۔ اور انسان سے قلندر بنا دیتا ہے۔ اس لئے بادشاہِ قلندروں سے خوف کھاتے تھے۔

ہم سے قلندروں کو نہ چھیڑا کریں حضور
ہم آہ بھی کریں تو فلک میں شگاف ہو

اس طرح میری غزل میں تتلی کا استعارہ کثرت سے موجود ہے، اسی طرح قلندر بھی مختلف انداز میں موجود ہے۔

سرِ دست یہ آخری شعر ۔

تو وہ امیر جو محتاج ہے فقیروں کا
میں وہ فقیر جسے بادشاہ مانگے ہے

ہرے بھرے بابا

پُونا آنے کے بعد بھی فقیروں سے میرا کم کم ہی سہی لیکن واسطہ ضرور رہا ہے۔ یہاں پونے میں مستان جھک کی درگاہ پر بوقتِ نماز حاضری دینے کا شرف کئی بار حاصل ہوا ہے۔ اسی کے پہلے روحانی بزرگ جو محمد تغلق کے زمانے میں اپنے بہت سے مریدوں کے ساتھ تشریف لائے۔ خواجہ شیخ صلاح الدینؒ کے مزار پر حاضری کا شرف بار بار حاصل ہوا ہے۔ پڑوس میں ندی کنارے حضرت حسام الدین قتال زنجانیؒ کا مزار ہے۔ وہاں بھی اکثر نیاز دینے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ چوں کہ ان مزارات سے متصل مساجد بھی ہیں۔ لہٰذا نماز کے اوقات میں جاتا ہوں۔ ویسے گھر سے نیت باندھ کر کبھی ان بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری نہیں دی البتہ شیوا پور کھیڑ میں ایک ایسے بزرگ محوِ استراحت ہیں جن کے دربار میں حاضری کے لئے گھر سے نیت باندھ کر ہی سفر کرنا ہوتا ہے۔ آپ ہیں حضرت قمر علی درویشؒ۔ یہ جگہ یہاں سے تقریباً 25 میل کے فاصلے پر ہے، اس لئے برسوں کے بعد وہاں حاضری کا شرف ملتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت قمر علی درویشؒ انیس برس کی عمر میں واصلِ حق ہوئے تھے اور شیوا پور کھیڑ کے جنگل میں ان کی تدفین عمل میں آئی تھی۔ آج یہاں بستی آباد ہو چکی ہے۔ درویشؒ کے چاہنے والے دور دراز علاقوں سے حاضر ہوتے ہیں اور اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اس درویشؒ کے دربار میں فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے بھی کثرت سے آتے ہیں اور اپنی عقیدت کے مطابق سلام عرض کرتے ہیں۔ شاہوں کے ساتھ ساتھ یہاں دوسرے مقامات سے مستان اور ملنگ قسم کے بزرگ بھی حاضری دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ایک بار جب مجھے حاضری کا شرف حاصل ہوا تو دیکھا کہ وہاں 'ہرے بھرے بابا' کے نام کی دھوم مچی ہے۔ کئی لوگ ان کے آگے پیچھے حلقہ بنائے موجود ہیں۔ کوئی ان کا دامن چوم رہا ہے، کوئی ان کے ہاتھوں کو آنکھوں سے مس کر رہا ہے۔ کچھ لوگ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ ان کے سر عقیدت سے جھکے ہیں۔ میں دور سے کھڑا یہ عقیدت مندانہ منظر دیکھتا رہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس درمیان میں نے ہرے بھرے بابا سے صرف ہاتھ ملایا تھا۔

کچھ دنوں بعد اتفاق سے پھر میرا جانا ہوا۔ درگاہ پر ہرے بھرے بابا دکھائی نہیں دیئے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ درگاہ سے ذرا فاصلے پر ہائی وے کے اس طرف ایک ہوٹل کی دوسری منزل پر ہرے بھرے بابا قیام فرما رہے ہیں۔ جمیل کاتب بھی میرے ساتھ تھے۔ جمیل صاحب کو مجھ سے زیادہ باباؤں کی تلاش تھی۔ ہم جب ہوٹل کے اوپر والے کمرے میں گئے تو وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اکثریت نوجوانوں کی تھی جو بغیر کسی عمل اور مشقت کے صرف دعاؤں کے سہارے دنیا کی کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہم دونوں نیچے آنا چاہ رہے تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ بابا ایک شخص کو گالیوں سے نواز رہے ہیں۔ ایسی گالیاں جو گلی کوچوں میں

بدمعاش اور غنڈے قسم کے لوگ ایک دوسرے کو پیش کرتے ہیں۔ بے لباس گالیاں، جن میں گھر کی تمام باعزت خواتین کو بلا تکلف یاد کیا جا رہا تھا۔ کمرے میں بابا کی گالیوں کی گونج کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ دعاؤں کی تمنا میں بزرگوں کو تلاش کرتے ہیں۔ مجھے گالیوں سے روحانی اذیت ہوتی ہے۔ وہ گالی چاہے کسی غنڈے کی زبان سے برآمد ہو، یا کسی پہنچے ہوئے فقیر کی زبان سے نکلی ہو۔ میں وہاں سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ میری قوتِ برداشت مجھ سے بغاوت کر رہی تھی۔ میں نے ضبط کی ڈور سے اسے باندھنا چاہا۔ اسی دوران بابا نے ایک ڈنڈا اٹھایا اور اس شخص کی کمر پر دو چار ڈنڈے رسید کر دیئے۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا اور میں جمیل کاتب کو لے کر نیچے ہوٹل کی میز پر چلا گیا۔ کچھ لمحوں بعد وہ شخص گھر جانے کے لئے نیچے اتر آیا۔ ہم کو دیکھ کر اپنی جھینپ مٹانے لگا۔ کام ہو گیا۔ بابا نے مجھے ڈنڈا مار دیا اور مجھے گالیوں سے نواز دیا، میں کامیاب ہو گیا، میں اسے دیکھنے لگا کہ کیسے کیسے لوگ کیسی کیسی سوچ رکھتے ہیں۔ گالیاں کھا کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور انہیں بدمزگی کا ذرا احساس بھی نہیں ہوتا، ایسے لوگ عزتِ نفس کہاں رہن رکھ دیتے ہیں۔

ایک آدمی جو پیشے کے لحاظ سے تاجر تھا۔ اس نے بابا کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ مجھے بھی بلا لیا۔ ہال میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے مسائل بابا کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ میں اور جمیل کاتب ایک طرف کونے میں خاموش بیٹھے تھے۔ ایک بار جب بابا ایک خوب صورت اور جدید کپڑوں میں آدھی لپٹی ایک لڑکی کے مسائل ملاحظہ فرما رہے تھے، وہ ان کے اتنے قریب بیٹھی ہوئی تھی کہ دونوں کی آپس میں سانسیں الجھ رہی تھیں۔ اسی دوران بابا کی نظر سے میری نظر اُلجھ گئی اور بابا ایک دم بوکھلا گئے۔ جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔ دوسرے ہی پل بابا اپنی جگہ سے اٹھے اور ہال کے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے صاحبِ خانہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ بھی کر گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بابا کس بات سے خفا ہو کر چلے گئے۔ دو منٹ بعد صاحبِ خانہ میرے پاس آ کر مجھے باہر لے گئے اور بڑی لجاجت کے ساتھ کہنے لگے۔

''آپ کی وجہ سے بابا کو روحانی تکلیف ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ باہر نکل گئے۔ اب آپ بھی چلے جائیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''میری وجہ سے کیوں تکلیف ہوئی۔'' کہنے لگے۔ ''آپ درود شریف پڑھ رہے تھے''۔ میں خاموش ہو گیا، حالاں کہ میں نہ درود شریف پڑھ رہا تھا، نہ کوئی اور وظیفہ میری زبان پر تھا۔ ہاں میرا قصور اتنا تھا کہ میں دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہا تھا۔''

(جاری ہے)

◆◆◆

''اس پرچے کے مضامین پر ''انجمنِ خیال'' کے لیے اپنی رائے لکھیے''

(ادارہ ''تخلیق'')

یاد نگاری

کرنل مجید ملک

.....4.....

شفیع عقیل

1958ء میں مجید ملک صاحب کو ایک افسوس ناک واقعہ سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہ فروری کے ابتدائی دن تھے اور اس وقت ان کی رہائش دیپ چند اوجھا روڈ پر پیپی ہوم ہی میں تھی۔ وہ اسی روز دوپہر کو انقرہ ترکی سے واپس آئے تھے جہاں معاہدہ بغداد کانفرنس کے اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی کرنے گئے تھے۔ وہ جس روز واپس آئے تھے اسی رات چور آئے اور دیوار سے سیڑھی لگا کر مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے ملک صاحب کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے منہ پر کپڑا باندھ دیا تھا اور دیگر افراد کو کمرے میں بند کر کے ساز و سامان چوری کر کے لئے گئے۔ چنانچہ 4 فروری کے ''جنگ'' کراچی میں ''کرنل مجید ملک کے ہاں چوری'' کے عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ چور پانچ ہزار روپے مالیت کے زیورات اور دوسری قیمتی اشیا چرا لے گئے تھے۔ اس وقت کے ہزار کو آج کے لاکھ سے بدل لیجیے تو نقصان کا اندازہ ہو جائے گا۔ چوری کا جب پتا چلا تو میں اور یوسف صدیقی صاحب اظہار افسوس کے لیے ان کے گھر گئے ملک صاحب بڑے نڈھال سے کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے کیونکہ دو چار اور لوگ بھی موجود تھے، غالباً وہ بھی اسی سلسلے میں افسوس کرنے آئے تھے۔ یوسف صدیقی کے ملک صاحب سے دہلی سے تعلقات تھے، وہ کہنے لگے۔

''ملک صاحب! چوری کا سُن کر بڑا افسوس ہوا؟''

جواب میں آہستہ سے بولے۔

''سامان تو جو گیا سو گیا، ظالموں نے مجھے باندھ دیا۔ بڑی اذیّت ہوئی۔''

اس موقعے پر میں نے بھی گفتگو میں اپنا حصّہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپ نے شور بھی نہیں کیا؟''

میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''عزیزم! انہوں نے شور کرنے کے قابل چھوڑا ہوتا تو شور کرتے.....!''

مجید ملک صاحب ایک ہی روز پہلے معاہدہ بغداد کانفرنس سے فارغ ہو کے واپس آئے تھے۔اس کانفرنس کے اجلاس ذہنی طور پر تھکا دینے والے تھے، اوراس پر آتے ہی وہ اس حادثے سے دوچار ہو گئے تھے مگراس کے باوجود ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہیں تھے اور وہ حسبِ معمول تحمل سے دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔

جس سال مجید ملک صاحب کے ہاں فروری میں چوری ہوئی تھی، اسی برس 27/اکتوبر 1958ء کو ملک میں جنرل محمد ایوب کا مارشل لا لگ گیا تھا۔ یہ مارشل لا لوگوں کے لیے پہلا تجربہ تھا اور اس کا ردِعمل بھی بعد کی مارشل لاؤں سے قدرے مختلف تھا۔ ماحول میں ایک خوف تھا اور ہر شخص اپنی جگہ سہما اور دہلا ہوا نظر آتا تھا۔ اخبارات و رسائل پر سنسر (Censor) لگ گیا تھا اور اخبار والوں کو چھپنے سے پہلے ساری کاپیاں سنسر کروانی پڑتی تھیں۔ میں اس زمانے میں ''جنگ'' میں ہفتہ وار طنزیہ و مزاحیہ کالم ''گردوپیش'' کے عنوان سے لکھتا تھا۔ میں نے مارشل لا کے دوسرے یا تیسرے روز معمول کے مطابق اپنا کالم لکھا جس میں کچھ لطیفہ قسم کے ایسے واقعات تحریر کیے تھے جن کا تعلق مارشل لاء سے تھا۔ ان کو لطیفے بھی نہیں کہا جا سکتا تھا بلکہ کچھ عام سے واقعات تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ اس طرح تھا:

> ''ایک آدمی بڑے مزے سے گنڈیریاں چوستا ہوا سڑک پر جا رہا تھا۔ وہ ایک گنڈیری چوستا اور اس کا چھلکا یا پھوک سڑک پر پھینک دیتا۔ دوسری گنڈیری چوستا اور بڑے بے پروائی سے چھلکا ایک طرف پھینک دیتا۔ اس طرح وہ گنڈیریاں اور چھلکے ادھر اُدھر پھینکتا جا رہا تھا۔ جب وہ اپنی آخری گنڈیری چوس چکا تو بڑے اطمینان سے اس نے ہاتھ جھاڑے، منہ صاف کیا اور ابھی قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اچانک پیچھے سے اس کے کندھے پر ایک سخت اور بھاری بھرکم ہاتھ لگا۔ اس نے چونک کے پلٹ کر دیکھا تو ایک نوجوان فوجی کندھے سے بندوق لٹکائے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اس نے گنڈیریاں چوسنے والے کو ایک بھرپور نظر سے دیکھا اور رعب دار آواز میں بولا۔
>
> ''پیچھے چلیے اور جہاں جہاں گنڈیریوں کے چھلکے پھینکے ہیں انہیں اپنے ہاتھوں سے اٹھایئے!''
>
> بے چارہ گنڈیریاں چوسنے والا سہم گیا۔ الٹے قدم پلٹا اور جہاں جہاں چھلکے پھینکتا آیا تھا سب اکٹھے کرتا اور اٹھاتا چلا گیا۔ فوجی جوان بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ اپنے پھینکے ہوئے تمام چھلکے اُٹھا چکا تو فوجی نے اس سے کہا۔
>
> ''سارے چھلکے کوڑے کی جگہ پر پھینکیے اور آئندہ سے صفائی کا خیال رکھیے۔''

میں نے نمونے کے طور پر کالم کا صرف ایک ٹکڑا تحریر کیا ہے، اسی طرح کے کچھ لطیفہ قسم کے واقعات تھے جن کا تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مارشل لا ہی سے تھا مگر یہ تنقیدی نقطہ نظر سے نہیں لکھے گئے تھے محض تفنن طبع کے لیے کچھ واقعات تھے جو دیکھنے، سُننے اور اخباروں سے پڑھنے میں آئے تھے۔ اس دور میں اخبارات لیتھو کی چھپائی سے شائع ہوتے تھے۔ میں سنڈے ایڈیشن کی

کاپیاں لگوا رہا تھا جس میں میرا اپنا کالم بھی تھا۔ جب میں اپنا کالم کاپی میں لگوا رہا تھا کہ اتنے میں نیوز ایڈیٹر یوسف صدیقی آ گئے اور انہوں نے پوچھا۔

''تم نے اپنا کالم سنسر کروالیا ہے؟''

عین اس وقت مجھے خیال آیا کہ واقعی مجھے اپنا کالم سنسر کروانا چاہیے تھا چنانچہ میں نے کالم لیا اور سیدھا محکمۂ اطلاعات میں کرنل مجید ملک صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اپنا کالم ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب ذرا یہ کالم دیکھ لیجیے!'' انہوں نے کالم پڑھا، کچھ سوچا..... پھر دوبارہ اُچٹتی سی نظر کالم پر ڈالی اور کرسی پر پیچھے کی طرف جھک کر دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں ملا کر انگوٹھے گھمانے لگے۔ لمحہ بھر خاموش رہے اور پھر اپنے بھاری پپوٹے اُٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''عزیزم! یہ کیا ہے؟''

میں نے جواب میں کہا۔

''ملک صاحب! کوئی خاص بات نہیں۔ بس لطیفہ قسم کے چند واقعات ہیں۔''

اس پر ملک صاحب نے کہا۔

''مگر تم تو طنز و مزاح لکھتے ہو، اپنے گرد و پیش میں؟''

پیش تر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا، کہنے لگے:

''تم فلاں افسر کے پاس جاؤ اور اسے چیک کروالو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

انہوں نے جس افسر کے پاس جانے کو کہا تھا، وہ ایک میجر تھا۔ کراچی ہا کی اسٹیڈیم کے پاس والی بڑی عمارت جواب پاکستان نیوی کا ہیڈ آفس ہے، اس میں مارشل لاء کے اس شعبے کا دفتر قائم تھا جو تعلقات عامہ اور سینسر وغیرہ کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس وقت ''جنگ'' کے چیف رپورٹر اطہر علی تھے جو بعد میں بی بی سی لندن میں پروڈیوسر بنے تھے۔ میں نے ٹیلی فون کر کے اطہر علی کو بلا لیا اور ہم دونوں اس دفتر چلے گئے جہاں وہ میجر صاحب بیٹھتے تھے۔ ایک تو مارشل لا کا دبدبہ اور دوسرے موصوف ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تیز مزاج تھے۔ کالم پر نظر ڈالتے ہی چمک کر بولے۔

''یہ آپ نے لکھا ہے.....؟''

''میں نے مسکینی سی صورت بناتے ہوئے جواب دیا۔

''جی ہاں.....!''

''کیوں لکھا ہے.....؟ آپ کو معلوم نہیں مارشل لا ہے؟؟''

میں نے عرض کیا۔

''جی معلوم ہے۔اسی لیے تو کالم آپ کے پاس لایا ہوں۔اس میں مارشل لا کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔''

یہ سنتے ہی ایک دم بھڑک اٹھے اور بڑے تحکمانہ لہجے میں بولے۔

''خلاف ہو یا حق میں ہو۔آپ نے لکھا کیوں ہے؟''

عجیب میجر تھا۔میری بات سننے اور سمجھنے کی بجائے اپنی کہے جا رہا تھا۔اس صورت میں کسی دلیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔آخر میں نے تنگ آ کر معذرت کے انداز میں کہا۔

''جناب! میں شائع نہیں کروں گا۔''

اس پر بھی پہلے کے سے تیز و تند لہجے میں بولے۔

''شائع تو یہ ہو ہی نہیں سکتا۔میں تو یہ پوچھ رہا ہوں آپ نے لکھا کیوں ہے؟''

اتفاق سے ہماری نظر ابن الحسن اور ایم ایچ عسکری پر پڑی۔دونوں فوج میں رہے تھے اور دونوں کا تعلق ادب اور صحافت سے تھا۔مارشل لا لگنے پر دیگر بعض فوجیوں کے ساتھ انہیں بھی واپس بلا لیا گیا تھا۔خوش قسمتی سے ان کی ڈیوٹی اسی شعبے میں تھی، دونوں ہمارے دوست تھے اور انہوں نے بھی مجھے اور اطہر علی کو دیکھ لیا تھا۔چنانچہ ابن الحسن جو ادبی دنیا اور احباب میں ابّن کے نام سے معروف تھے، وہ ہمارے پاس آئے اور پوچھنے لگے۔

''تم یہاں کہاں آئے ہو؟ کیا مسئلہ ہے؟''

ہم نے انہیں اپنی بپتا سُنائی اور انہوں نے خدا جانے اُن تیز مزاج میجر سے کیا بات کی کہ وہ میز پر اپنا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولے۔

''جایئے.....آئندہ خیال رکھیے!''

خدا خدا کر کے جان چھٹی تھی۔چلتے وقت میں میز پر رکھا اپنا کالم پکڑنے لگا تو حکم ہوا۔

''اسے یہیں رہنے دیں۔ہمارے ریکارڈ میں رہے گا۔''

میں نے واپس آ کر مجید ملک صاحب کو ساری روداد سنائی اور کہا۔

''ملک صاحب! انہوں نے میرا کالم اپنے پاس رکھ لیا ہے۔کہیں مجھے پھر نہ بُلا لیں؟''

میز پر رکھی ہوئی ایک فائل کے ورق اُلٹتے ہوئے بولے۔

''فکر کی بات نہیں.....ان کو تو بعد میں یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ یہ کیا ہے اور کیوں رکھا ہے۔کسی فائل میں دفن ہو جائے گا۔انہیں ادب سے کیا لینا.....؟ گھبراؤ نہیں، جاؤ!''

ملک صاحب خود انگریز کی فوج میں رہ چکے تھے، یہی نہیں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے فوج میں تھے لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ فوجی انقلاب اور مارشل لا کے حق میں نہیں تھے۔ان کا کہنا تھا کہ حکومت چلانا سیاست دانوں کا کام ہے۔ہو سکتا ہے

ان کی اس سوچ کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ خود جدوجہد آزادی میں شریک رہے تھے۔ایک دو بار بعد میں، مَیں نے بھی اس موضوع پران کے خیالات سُنے تھے ان سے بھی یہی اندازہ ہوا کہ وہ مارشل لا کے خلاف تھے۔ویسے بھی جب اکتوبر 1958ء میں مارشل لا لگا تھا اور اگلے برس اکتوبر 1959ء ہی میں وہ ریٹائر ہو رہے تھے اس لیے بھی ملک کی اس تبدیلی سے دل برداشتہ تھے۔ایک بار باتوں باتوں میں انہوں نے کہا تھا۔

''یہ اقدام قیامِ پاکستان کے مقصد ومنشا کے خلاف ہے۔پاکستان کی روح کے منافی ہے۔''

اپنی سرکاری ملازمت کے دوران مجید ملک صاحب نے ایک سے زائد وزرائے اعظم کے ساتھ کام کیا اور کئی ممالک میں ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کی۔انہوں نے متعدد بین الاقوامی اجلاس میں اپنے ملک کی نمائندگی بھی کی اور کئی حکومتوں کے عروج وزوال بھی دیکھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد کولمبو پلان کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر مقرر ہو کر کولمبو چلے گئے تھے جہاں انہوں نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں جنوب اور جنوبی مشرقی ایشیا کے متعدد ممالک کے دورے کیے تھے اور تقریباً ڈیڑھ دو برس بعد پاکستان آئے تھے۔

مجید ملک صاحب نے بڑی بھرپور زندگی بسر کی تھی۔ان کے حلقۂ احباب میں صفِ اول کے ادیب، شاعر، صحافی، ماہرین قانون اور سرکاری افسر شامل ہوتے تھے۔انہوں نے برصغیر میں آزادی کی تحریکوں کا بڑے قریب سے مطالعہ ومشاہدہ کیا تھا چونکہ وہ انگریز حکومت میں ایسے اہم عہدے پر فائز تھے جس کا براہ راست تعلق سیاست دانوں اور سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ اعلیٰ سرکاری افسروں سے ہوتا تھا اس لیے وہ تقسیم ہند کے عینی گواہ ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک، کسی نہ کسی حیثیت سے اس میں شریک بھی رہے تھے۔یہ انگریزی حکومت کا آخری دور تھا، جب تقسیم ہند کے منصوبے کے خدوخال ترتیب وتشکیل دیے جا رہے تھے اور اس سلسلے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے رہنماؤں اور برطانوی حکومت کے نمائندوں کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے، اس لیے یہ تقسیم کے مختلف مراحل سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت کی اندرونِ خانہ سرگرمیوں سے بھی واقف ہوتے تھے اور ان کی شاطرانہ چالوں سے بھی باخبر ہوتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ انہوں نے انگریز حکومت کی ملازمت ترک کر کے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ان کے قائداعظم محمد علی جناح اور نواب زادہ خان لیاقت علی خان سے بھی قریبی تعلقات تھے اور دونوں قوموں کے چھوٹے بڑے اہم لیڈروں سے بھی آشنائی تھی۔اس طرح ملک صاحب نے تحریک آزادی، تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے تمام مراحل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔اسی پس منظر کی بنا پر ہم نے انہیں کئی بار کہا۔

''ملک صاحب! اپنی یادداشتیں تحریر کر دیں!''

لیکن وہ ایک تو مصروف ہوتے تھے اور دوسرا بے نیاز طبیعت کے مالک تھے۔جس شخص نے اپنی شاعری اور دیگر تحریریں سنبھال کے نہ رکھی ہوں، وہ لکھنے کی طرف کیسے مائل ہوتا۔اس کے باوجود میں انہیں مہمیز کرتا رہتا تھا۔میں چونکہ روزنامہ ''جنگ'' کا میگزین ایڈیٹر تھا اس لیے جب کبھی ان سے سامنا ہوتا تو یاد دلا دیتا تھا لیکن ان کا جواب نہ ہاں میں ہوتا تھا اور نہ ہی انکار میں۔بس

خاموش رہتے تھے۔شاید اپنی پرانی یادوں کے لیے ماضی میں گُم ہو جاتے تھے تاہم مسلسل اصرار کا اثر ہوا اور آخر انہوں نے یہ کہتے ہوئے ہامی بھر لی۔

''اچھا، دیکھتے ہیں۔شاید کوئی بات بن جائے۔''

اور پھر واقعی بات بن گئی انہوں نے ''چند یادیں'' کے عنوان سے اپنی یادداشتیں لکھنا شروع کر دیں جو ''جنگ'' کے سنڈے ایڈیشن میں قسط وار شائع ہونے لگیں۔اس سلسلے کا مستقل عنوان تو ''چند یادیں'' تھا لیکن ہر ہفتے متن اور مضمون کے حوالے سے مختلف بڑی سُرخی بھی لگا دی جاتی تھی۔ملک صاحب نے اصرار کر کے عنوان کے ساتھ ایک شعر بھی لکھوایا تھا جو ہر ہفتے عنوان کا حصہ ہوتا تھا۔یہ شعر اس طرح تھا ؎

انہیں ہم نے پرانی داستانیں
سنائیں کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

◆◆◆

قلمی معاونین سے گزارش

1- اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات فل سکیپ کاغذ کے ایک طرف خوش خط لکھ کر بھیجیں۔
2- کمپیوٹر کتابت میں بھیجی گئی تخلیقات کا بے حد مسرّت سے خیر مقدم کیا جائے گا۔
3- مسوّدے کی دو سطروں کے درمیان مناسب فاصلہ ضرور چھوڑیں۔
4- دو پاسپورٹ سائز کی تصاویر کے ساتھ، اپنے مختصر حالاتِ حیات بھی ارسال فرمائیے۔
5- درخواست ہے کہ ''تخلیق'' کو بھیجی گئی تخلیقات کسی اور رسالے کو تا اطلاع نہ بھیجیں۔مضمون کے آخر میں ''غیر مطبوعہ'' ہونے کی اطلاع دیجئے۔
6- ''انجمنِ خیال'' کے خطوط میں مضامین پر مدلل بحث وتنقید کیجئے۔
7- ''ایڈیٹنگ'' کے حقوق محفوظ ہیں۔اور تحریر میں اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
8- ''تخلیق'' کی معیّنہ ضخامت میں طویل مضامین شائع کرنا ممکن نہیں۔ازراہِ کرم ہماری ''اختصار سے لکھیے'' تحریک میں تعاون کیجئے۔

(ادارہ ''تخلیق'')

تبت سنو کا روزانہ استعمال جلد کو ریشم کی طرح نرم و ملائم بنائے چھائیاں، داغ دھبے دور کرے
اور اس کے خاص اجزا، جلد کو عمر کے اثرات اور جھریوں سے عرصہ دراز تک محفوظ رکھیں۔
بہتر نتائج کے لئے دن میں اور رات سونے سے پہلے استعمال کیجئے۔

تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

روس کی ایک جھلک

پروفیسر جمیل آذر

''روس کی ایک جھلک''، محترمہ سلمیٰ اعوان کا نیا سفر نامہ ہے جو گذشتہ 2010ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آیا۔ اس سفر نامہ سے پہلے ان کے تین ملکی اور ایک غیر ملکی سفر نامے قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ملکی سفر ناموں میں ''یہ میرا بلتستان''، ''میرا گلگت وہنزہ'' اور ''سندر چترال'' اور غیر ملکی سفر نامہ میں ''مصر میرا خواب'' شامل ہیں۔ اس طرح ان کے اب تک بشمول اس سفر نامہ کے پانچ سفر نامے ایوان اردو میں جگمگا رہے ہیں۔ ان کارہائے نمایاں (achievements) سے صاف ظاہر ہے کہ سلمیٰ اعوان پیدائشی طور پر سیّاح ہیں۔ خالقِ کائنات نے انہیں تخلیق ہی اس مقصد کے لئے کیا ہے کہ وہ قریہ قریہ، ملکوں ملکوں گھومیں، پھریں اور ربِ کائنات کی تخلیق کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں۔ خود بھی اس پراسرار کائنات سے لطف اندوز ہوں اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کریں۔ اپنے اس مقصد میں سلمیٰ اعوان نہایت کامیاب ہیں۔

سلمیٰ اعوان سے بالمشافہ میری ملاقات ابھی تک نہیں ہوئی ہے تاہم میرا ان سے پہلا تعارف ملک مقبول احمد کی کتاب ''سفر جاری ہے'' کے توسّط سے ہوا جس میں ان کی خوبصورت رنگین تصویر دیگر خواتین مصنفّین کے ساتھ موجود ہے۔ ملک مقبول احمد ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے قدر دان ہیں انہیں جہاں بھی علم و دانش کے موتی نظر آتے ہیں، وہ چن چن کر انہیں مقبول اکیڈمی میں سجا لیتے ہیں۔ سلمیٰ اعوان کا دامن بھی علم و دانش کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے اور وہ مقبول اکیڈمی میں اپنی انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ملک مقبول احمد اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' میں ان کا تعارف ان الفاظ سے کراتے ہیں۔

> ''محترمہ سلمیٰ اعوان ایک اعلیٰ پائے کے سکول کی سربراہ ہیں اور بہت اچھی ناول نویس بھی ہیں۔ برادری کے حوالے سے میری بہن ہیں لیکن کبھی کبھی معمولی سی بات پر مجھے ڈانٹ بھی پلا دیتی ہیں۔ اس وقت ان کا روپ مصنّفہ کا نہیں استانی کا ہوتا ہے۔ ان کی جو کتابیں میں نے شائع کی ہیں ان میں ''میرا گلگت وہنزہ'' اور ''تنہا'' قابلِ ذکر ہیں۔''

یوں سلمٰی اعوان میرے ذہن کے کسی گوشے میں طلسماتی طور پر چھپ کر بیٹھ گئیں۔ اس مصروف دنیا میں کون کسی کو یاد رکھتا ہے لیکن میرا ایمان ہے کہ ہم جب کسی کو روحانی طور پر یاد کرتے ہیں یا وہ روحانی طور پر ہمارے دل میں موجود ہوتا ہے تو ہمارا ایک روحانی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے دنیا دار عملی لوگ (Pragmatic people) سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایک روز میری نظر استنبول کے حوالے سے لکھے ہوئے ایک مضمون پر پڑی تو اس تحریر کی مصنّفہ کا نام سلمٰی اعوان بھی پڑھا۔ یہ مضمون (سفر نامہ کے طور پر) کسی اخبار میں میری نظر سے گزرا تھا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ پھر اچانک ایک روز ڈاک میں ایک کتاب موصول ہوئی۔ یہ کتاب سلمٰی اعوان کی ''روس کی ایک جھلک'' کے نام سے تھی اور انہوں نے نہایت خلوص و محبت کے ساتھ مجھے ارسال کی تھی اور ساتھ ہی ایک خط بھی تھا جس میں انہوں نے از راہ لطف و کرم اس کتاب پر چند حروف لکھنے کے لیے بھی کہا۔ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ میرا ان سے غائبانہ و روحانی رشتہ تو پہلے ہی استوار ہو چکا تھا اسی لئے انہوں نے یہ کتاب مجھے خاص طور پر بھجوائی۔ اپنی علالت کے باوجود میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔

''روس کی ایک جھلک'' کا پہلا ہی باب پڑھا اور لطف آ گیا۔ مصنّفہ کی کرداروں کے مشاہدہ پر گہری دسترس ہے۔ زبان میں بے تکلفی اور بیان میں بول چال کا اسلوب سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مصنفہ جمال پرست ہیں۔ وہ جب پی۔ آئی۔ اے کی موجودہ ایر لائنز میں سفر کرتی ہیں تو اپنی پسند اور ناپسندیدگی کا اس طرح اظہار کرتی ہیں۔

''فضائی میزبان خواتین الف سے یے تک سب گوارہ اور گزارا تھیں۔ مرد بھی ایسے ہی جھانپڑ سے تھے۔ پتہ نہیں پی۔ آئی۔ اے کے ہاں حُسنِ مردوزن کا قحط کیوں پڑ گیا ہے؟ یا سلیکشن بورڈ ''حُسن بلائنڈ'' ہو گیا ہے۔''

اس جملے میں لفظ ''جھانپڑ'' مزہ دے گیا ہے۔ یہ مصنّفہ کے اظہار بیان میں بے تکلّفی اور عام بول چال کے الفاظ کو سلیقے سے استعمال کرنے کی فن کی نشان دہی کرتا ہے۔ جب اسلوب میں بے تکلّفی، بے ساختگی (Spontanity) اور سادگی جلوہ گر ہوتی ہے تو انشائی رنگ (تخلیقی روپ) اختیار کر لیتا ہے۔ اس اسلوب سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے اور اسے مفہوم و معنی کے ادراک میں مشکل کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ سلمٰی اعوان کا اسلوب بیان سادہ، رواں اور دلچسپ ہے اور قاری کو شروع سے لے کر آخر تک اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سلمٰی اعوان نے جس حُسن کے فقدان کا پی۔ آئی۔ اے کی پرواز میں ادراک کیا ہے اس کا مجھے بھی احساس ہوا تھا جب مجھے راولپنڈی سے کراچی تک اور واپسی میں اپنی ملکی پرواز میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن جب میں نے راولپنڈی سے دوبئی کا سفر ایمریٹ ایر لائنز سے کیا تھا تو سبحان اللہ لڑکے اور لڑکیوں کا حُسن و رعنائی قابلِ رشک تھا۔ اس پر مستزاد ان کی مستعدی، خوش خلقی اور میزبانی کے فرائض قابل تعریف تھے اور اب تو پی۔ آئی۔ اے کی پروازوں میں مسافروں کو لنچ گتّے کے ڈبوں میں اس طرح دیا جاتا ہے جیسے ان کی تواضع نہیں بلکہ انہیں خیرات دی جا رہی ہو۔

مصنّفہ جب روس کی سرزمین پر قدم رکھتی ہیں تو سب سے پہلے انہوں نے ''وضو کیا اور خوبصورت مسجد میں سجدہ دیا''۔ نماز واقعی مومن کی معراج ہے۔اس سے اطمینان قلب اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔سرد جنگ کے اختتام کے بعد روس کی غربت کا سلمٰی اعوان نے صحیح اندازہ لگایا۔

''روس کی غربت کا وہ حال تھا کہ اترنے سے قبل مسافر ہم سے بچی کچھی ڈبل روٹیاں، چاول، انڈے سبھی سمیٹ کر لے جاتے تھے۔خدا گواہ ہے میں تو خوف سے لرز جاتی تھی اور ان کے تھیلے ویلے سب بھر دیا کرتی تھی''۔

مجھے تو ڈر ہے کہ یہی صورتِ حال کہیں ہمارے ہاں بھی نہ ہو جائے۔اس سفرنامہ میں مصنّفہ نے فطرت کی منظر کشی کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔قاری ان فطری مناظر سے انبساط حاصل کرتا ہے۔

''بادلوں کی بھی ایک اپنی دنیا ہے۔کتنے رنگ ہیں ان کے۔نہ انہیں چین، نہ قرار، ہمہ وقت یوں بھاگتے پھرتے ہیں جیسے پولیس تعاقب میں ہے''۔

جب جہاز ایر پورٹ پر اترنے لگا تو مصنفہ جہاز کی کھڑکی سے کریملن کا نظارہ حیرت واستعجاب سے کرتے ہوئے اس طرح تصویر کشی کرتی ہے۔

''ہائے میرے اللہ کریملن! میں نے آنکھیں پھاڑ کر شیشے سے چپکا لیں، سرسبز مخملیں بلند قطعے پر سرخ دیواروں کی ایک ٹیڑھی میڑھی تکون میں جیسے کسی نے یہاں وہاں سبز چنبیلی رنگے سرخ سبز موتیوں کی ڈھیریاں رکھ دی ہوں۔''

''روس کی ایک جھلک'' جو 46 ابواب اور 484 صفحات پر مشتمل ہے محض کتاب نہیں بلکہ ایک طلسم ہوش ربا میوزیم ہے جس میں قاری داخل ہو کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔آپ جوں جوں کتاب پڑھتے جاتے ہیں توں توں روس کی بلند و بالا عمارات، باغات، تاریخی محلات، قد آور شخصیتوں کے مجسّمے، صاف ستھری سڑکیں، نظم ونسق کا انتظام، نیلے پانیوں کے سمندر اور آبشاروں سے لطف اندوز ہوتے چلے جاتے ہیں۔روسی قوم کے تعمیری جذبوں کو مصنفہ ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتی ہے۔

''روسی قوم کے ان جذبوں کو سلام! جنہوں نے بڑے بڑے محل میناروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے گلی کوچوں اور ان چوراہوں تک میں بکھری تاریخ کو رنگ وآہنگ کے پیرہن پہنا کر یوں معتبر بنا ڈالا کہ آج ثقافتی وتاریخی ورثے سے مالا مال ملکوں میں روس بہت نمایاں اور سربلند ہے۔'' سلمٰی اعوان بہت عمدہ افسانہ نگار ہیں، انہیں اپنے قلم پر مضبوط گرفت ہے اور جزیات نگاری کا فن آتا ہے۔مصنفہ ایک لڑکے کو بیچ کھاتے اور ٹی وی دیکھنے میں محو دیکھتی ہے۔بحیثیت افسانہ نگار بھلا وہ اسے بغور دیکھے بغیر کیسے رہ سکتی ہیں۔تجسس کے زیرِ اثر اس لڑکے سے کہتی ہیں اور کہتی بھی باڈی لینگویج (body language) میں یعنی اشاروں

سے ''کہ جو تم ٹھونگ رہے ہو مجھے بھی تھوڑے سے دو''۔اس پر اس نے ان کی ہتھیلی پر سیاہ بیج رکھ دیے۔یہ نمک میں بھنے ہوئے کدو کے بیج تھے لیکن اس لڑکے کے کھانے کے سلیقہ سے مصنّفہ بہت متاثر ہوتی ہیں کیونکہ یہ بیج کھا کر اس کے چبائے ہوئے چھلکے زمین پر پھینکنے کی بجائے اپنے ہاتھ میں اکٹھے کرتا تھا تا کہ وہ انہیں اس جگہ پر پھینکے جہاں کوڑا کرکٹ پھینکنے کے ڈھکن دار بڑے بڑے ڈسٹ بن(Dust Bin) رکھے ہوتے ہیں۔اس خورونوش کے سلیقے پر مصنفہ اس طرح اپنے ردِعمل کا اظہار کرتی ہیں۔

''اس نے میری ہتھیلی پر سیاہ بیج رکھ دیے۔نمک کے استر میں لپٹے ہوئے۔بیج تو وہی کدو کے۔پر کھانے کے انداز میں قوموں کی تہذیب اور چلن بولتا تھا۔''

مصنّفہ نے مصر کا دورہ بھی کیا ہوا تھا۔اب اس کا دھیان مصر میں لکسر کے ایک ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اس نے ایک مصری کو کچھ ایسے ہی بیج کھاتے دیکھا تھا۔اب آپ اس تقابل کا منظر مصنّفہ کے الفاظ میں پڑھیے۔''

''مصر میں لکسر کے ریلوے اسٹیشن پر میں نے ایک مصری کو انہیں کھاتے دیکھا۔چھلکوں کا ڈھیر اس نے اپنے اردگرد پھیلا رکھا تھا''۔اس کے برعکس استنبول میں صفائی ستھرائی کا یہ طریقہ تھا۔''استنبول میں ایک چھلکا زمین پر بکھرے نہیں دیکھا اور یہی حال یہاں تھا۔لڑکا چھلکا دائیں ہاتھ میں اکٹھے کیے جاتا تھا۔'' یہی وہ جزیات نگاری ہے جس نے اس سفرنامہ کو نہ صرف دلچسپ بنادیا ہے بلکہ ہمیں غور وفکر کے لمحات عطا کئے ہیں۔

سلمٰی اعوان نے اپنے سفرنامہ کو رنگین تصویروں سے مزّین کیا ہوا ہے جس سے قاری روس کی تاریخی عمارتوں، سائبیریا کی نسل کے بچوں اور لوگوں کے خدوخال اور مشہور قومی شخصیتوں کی تصویروں کو دیکھ کر حیرت انگیز طور پر مسرور ہوتا ہے۔میرے سامنے یہ ایک تصویر روس کے بے نظیر شاعر الیگزنڈر پشکن کی ہے اور اس کے ساتھ نتالیہ پشکن کی پرکشش تصویر بھی ہے۔ان دو تصویروں کے نیچے مونیکا(Monika) نہر کے کنارے اس عظیم شاعر کا وہ گھر دکھایا گیا ہے جہاں اس نے زندگی کی آخری سانسیں لیں۔آئزک سکوائر میں آئزک کیتھڈرل کی تصویر، دسمبرسٹ سکوائر میں پیٹر دی گریٹ کا کانسی کے مجسمہ کی تصویر اور دیگر جاذب نظر منظروں کی تصویریں دیکھ کر قاری ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔یہ خوبصورت سفرنامہ ایک حقیقی ناول بھی ہے اور بھرپور تاثر بھی، افسانہ بھی ہے اور حقیقت بھی، پوری گیلری بھی ہے اور چلتے پھرتے انسانوں کا انبوہ کثیر بھی۔مجھے حیرت ہے کہ سلمٰی اعوان نے روس جیسے ملک کو اپنے قلم کی گرفت میں کتنی مہارت اور ہنرمندی سے لے لیا ہے اور ہمیں اس کے کتابی مطالعے کی نعمت غیر مترقبہ سے مستفید کیا ہے۔مجھے امید ہے مصنفہ کی یہ تصنیف شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کرے گی۔

◆◆◆

گوشۂ اظہر جاوید

''تخلیق'' کے ایڈیٹر اظہر جاوید کے نام

اسلم گورداسپوری

''ایک محبِّ وطن اور ملک وقوم سے غیر مشروط محبت کرنے والا شاعر اور ادیب ہجرت کر گیا ہے۔''

''یہ واقعہ یا خبر نہیں المیہ ہے۔ یہ نوحہ نما باتیں اظہر جاوید نے ایک شاعر اور ادیب کے امریکہ جانے پر لکھی تھیں۔ بتاؤ! اظہر جاوید! اب تمہاری ہجرت پر کیا کہا جائے؟ تم نے تو ہجرت نہیں کی، کوچ کیا ہے۔ ملک اور شہر نہیں چھوڑا، تم نے تو دنیا ہی چھوڑ دی ہے۔ اظہر جاوید! تم نے اس ادیب کے بارے میں تحریر کیا تھا کہ جانے والا بہ خوشی نہیں گیا اس کا ہر خیال، ہر سوچ، ہر جذبہ یہیں اس سرزمین پر نکھرا اور اب یہیں بکھرا رہ جائے گا۔ اظہر جاوید! تم بھی تو خوشی سے نہیں گئے ہو۔ تمہارا ہر خیال، تمہارا ہر جذبہ، تمہاری ہر سوچ، یہیں ہمارے پاس ہے، ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ ہمارے ادب اور شاعری کا ایک ان مٹ حصہ ہے۔ تم اپنے تخلیق کردہ ماہنامہ ''تخلیق'' کی شکل میں ہمارے علم وادب اور ہمارے عشق ومحبت کے ایک قفس تھے جو اپنے احساسات کی تپش اور شدت سے بار بار مرتا ہے اور پھر اپنی ہی راکھ سے زندہ ہو جایا کرتا ہے۔

اظہر جاوید! تمہیں یاد ہے کہ میں تمہیں سنہری آدمی کہا کرتا تھا۔ ''گولڈن مین'' کہا کرتا تھا۔ مجھے تمہاری سرخ وسفید رنگت پر رشک آیا کرتا تھا۔ میں تمہیں بہت نازک انسان کہا کرتا تھا۔ مگر اس کے بدلے میں تم مجھے ہتھوڑا مار شاعر کہا کرتے تھے، لٹھ مار شاعر کہا کرتے تھے، جنگ جو شاعر کہا کرتے تھے۔

یہ بات ان دنوں کی ہے جب میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں عوامی مشاعرے کیا کرتا تھا۔ جب مجھے شاعرِ عوام کہا جاتا تھا۔ ان دنوں مجھے غزل کہنے کا بہت کم موقعہ ملا کرتا تھا۔ ان دنوں میں عوام کا نفسِ ناطقہ ہوا کرتا تھا۔ تم ''تخلیق'' کے لئے غزل کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ یہ تمام باتیں مجھے ایک ایک کر کے آج یاد آ رہی ہیں۔ آج تمہارے بیٹے سونان اظہر جاوید کا مجھے خط موصول ہوا ہے۔ اس کا بھی تمہاری ہی طرح مطالبہ ہے کہ ''اظہر جاوید نمبر'' کے لئے کچھ تحریر کر کے بھیجیں۔

اظہر جاوید! تمہیں مبارک ہو کہ تمہارا تخلیق زندہ ہے۔ تمہارے بیٹے کا مطالبہ ہے کہ 'تخلیق' کے لئے اظہر جاوید کے فن اور شخصیت کے لئے اپنی رائے کا اظہار کریں۔ تمہیں خوشی ہو گی کہ تمہارے بیٹے سونان اظہر جاوید کے خط کے مطابق تمہارے

دوستوں نے جن میں خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر انور سدید اور شاہد بخاری نے تمہارے ''اظہر جاوید نمبر'' کی خصوصی اشاعت کی ترتیب وتدوین کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں تمہارے دوست شاعر محمود شام سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مجھے علم ہے کہ ان کے ساتھ آپ کی بہت گہری دوستی تھی۔ آپ ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔

اظہر جاوید! تمہیں یاد ہے کہ میں نے ماہ دسمبر 2011ء میں آپ کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے ''تمغۂ حسن کارکردگی'' ملنے پر مبارک باد کا خط تحریر کیا تھا۔ جس خط کو ماہ دسمبر کے ''تخلیق'' میں شائع کیا گیا تھا۔ اس خط میں میں نے کہا تھا کہ جس قدر میں آپ کے تمغۂ حسن کارکردگی پر خوش ہوں وہ بیان سے بالا ہے۔ یہ اعزاز آپ کو بہت تاخیر کے بعد دیا گیا ہے۔ میری طرف سے ڈھیروں مبارکیں قبول فرمائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے قبیلے سے بھی کسی کو اعزازات کے معاملے میں یاد رکھا گیا ہے وگرنہ ہمارے قبیلے کے لوگوں کی کبھی باری ہی نہیں آیا کرتی تھی۔ اور یہ اعزازات ایک ہی گروہ کے لوگوں کو بار بار دیئے جایا کرتے تھے۔

اظہر جاوید! تمہیں یاد ہے میں جب بھی تازہ غزل کہتا سب سے پہلے وہ غزل تمہیں ارسال کیا کرتا تھا۔ جو غزل میں نے تمہیں ماہ جنوری 2012ء کو ارسال کی تھی وہ غزل ماہ فروری کے تخلیق میں شائع ہو چکی ہے جس غزل کے اس شعر پر تم نے مجھے بہت داد دی تھی ؎

محبتوں کے سبھی نَے نواز مارے گئے
کہ جن کے ہجر کے غم سے اُداس ہے بیلا

تم نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے اس شعر نے مجھے اداس کر دیا ہے۔ ساتھ ہی تم نے اپنی طبیعت کی ناسازی کا بھی ذکر کیا تھا۔ تمہارا وہ ذکر تمہاری ''بیروکریٹک'' انداز کے مطابق ہی تھا۔ جس میں ہر بات مختصر کی جاتی ہے۔ بے لحاظی سے کی جاتی ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ تمہاری طبیعت زیادہ خراب تو نہیں؟ مگر تم نے اپنے ہی لہجے میں کہا تھا کہ کوئی ایسی بات نہیں ٹھیک ہوں۔

کاش اظہر جاوید! میں تم سے مل لیتا۔ میں مل کر تمہاری طبیعت پوچھتا۔ مگر افسوس کہ تمہاری بے نیازی کی عادت سے ایسا نہ ہو سکا۔ اظہر جاوید! سقراط نے کہا تھا کہ موت کے بارے میں اچھی توقعات وابستہ کریں۔ اس نے کہا تھا کہ موت کو ایک برائی خیال کیا جاتا ہے مگر ایک نیک اور اچھے انسان کو کوئی برائی بھی ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی نہ اس دنیا میں نہ اُس دنیا میں۔

اظہر جاوید! تم تو بہت ہی نیک بہت ہی معصوم بہت ہی صابر بہت ہی خوددار بہت ہی کم طلب۔ بہت ہی مطمئن انسان تھے۔ تم اپنی شکل وشباہت میں ہی خوبصورت نہیں تھے تم اپنی سیرت میں بھی خوبصورت تھے۔ اندر سے بھی خوبصورت تھے۔ تم تو ایک درویشِ گوشہ گیر تھے۔ دنیا کی کوئی طمع کوئی لالچ تمہیں بازار میں آنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں تمہیں کبھی کسی کے دروازے پر دستک دیتے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی خواہشوں کی بھیڑ میں اور ضرورتوں کے ہجوم میں چلتے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے تمہیں ان تمام باتوں سے ہمیشہ کنارہ کشی میں پایا تھا۔ تمہارے اندر ایک فنکار تھا۔ ایک مصور تھا، ایک شاعر تھا، ایک تخلیق کار تھا جو تمہارے تخیلات کی سطح کو بہت بلند رکھتا تھا۔ جو اوپر دیکھنے کا عادی تھا۔ تمہارے اندر کا فنکار ایک بے نیاز اور

بے پروا فنکار جو اپنی جولانی طبع میں مست نہیں بدمست تھا۔

میں تمہاری اس جولانی طبع اور تمہاری خودداری کی سرمستی اور تمہارے تخلیقی قوتوں کی وحشتوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔ سقراط نے اپنی موت کے بارے میں کہا تھا کہ وہ جہان کتنا عظیم جہان ہے جہاں میں جا رہا ہوں۔ جہاں قدیم زمانے کا عظیم فلسفی شاعر ہومر ہوگا۔ جہاں موسیٰ جیسا پیغمبر ہوگا جہاں ''سرائے حسن'' کے عظیم معرکہ آرا ہوں گے جہاں اوڈیسس ہوگا جہاں سیسی فس ہوگا۔ جہاں پر تاریخی شہرت کے حامل انسان ہوں گے جن کی دیومالائی شہرت کے ہم آج بھی گرویدہ ہیں۔ میں ان تاریخی انسانوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ایک غیر فانی انسان بن جاؤں گا جس انسان کو دوبارہ موت کی اذیت سے نہیں گزرنا پڑے گا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس صورت میں میں چھوٹے انسانوں سے اُٹھ کر بڑے انسانوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ لہٰذا موت کسی اعتبار سے بھی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔

اظہر جاوید! تم بھی اس عالمِ غیر فانی میں چلے گئے ہو جہاں میر تقی میر ہوگا، سودا ہوگا، مرزا غالب ہوگا، حافظ شیرازی ہو گا، اقبال ہوگا، فیض ہوگا، احمد ندیم قاسمی ہوگا، ظہیر کاشمیری ہوگا، سقراط ہوگا، کارل مارکس ہوگا، ارسطو ہوگا، افلاطون ہوگا، بہزاد ہوگا، مانی ہوگا۔ جہاں تان سین ہوگا، بڑے غلام علی خاں ہوں گے، نصرت فتح علی خان ہوگا، امانت علی خان ہوگا، سلامت علی خان ہوگا، نور جہاں ہوگی، بڑے بڑے سائنس دان ہوں گے۔

اظہر جاوید! تو بڑا انسان تھا۔ بڑے انسانوں میں پہنچ گیا ہے۔ خدا تمہیں کروٹ کروٹ اپنے فردوس میں جگہ عطا کرے۔ تم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ تمہیں راحتیں عطا کرے جس پر تمہاری اس دنیا کی تمام کلفتیں دور ہو جائیں۔ آمین ثم آمین! یار اظہر جاوید! بابا ظہیر کاشمیری کو میرا بہت بہت سلام کہنا۔

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

موت سے کیا گلہ کریں گے ہم
زیست پر بھی تو اختیار نہیں
کاش نفرت ہی کوئی ہم سے کرے
کیا ہُوا اگر کسی کو پیار نہیں

رُوح افزا اور کیا چاہیئے!

برموسم کا مشروب

ہمدرد

Brands Award 2011

خلوص وانکسار کا پیکر۔اظہر جاوید

دیپک بدکی (انڈیا)

دو دو زبانوں کے ادیب اور صحافی اور دونوں زبانوں پر ایک جیسی مہارت رکھنے والے ہمہ جہت قلم کار دنیا میں بہت کم ملتے ہیں۔ایسے ہی قلم کاروں میں ایک نمایاں نام ہے۔اظہر جاوید، جو برصغیر ہندو پاک اور اردو کی نئی بستیوں میں بحیثیت مدیر اعلیٰ، ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور کے مقبولیت سے سرفراز ہوئے۔حالانکہ انہوں نے خودنمائی اور خودستائش سے ہمیشہ گریز کیا اور اس کے بدلے ساری عمر عجز اور انکساری سے کام لیا مگر ان کے تبحّرِ علمی اور خلوص نیّت کا اعتراف پوری اردو دنیا کرتی ہے۔کہاں تو عام شاعر بڑے بڑوں سے روشنی مستعار لے کر اپنے چراغ روشن کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے اور کہاں اظہر جاوید کی کسرِ نفسی کی قابلیت اور صلاحیت کے باوجود خود کو حقیر کہتے تھے۔وہ اپنی صلاحیتوں کی نمائش نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اپنے کلام اور نثری تحریروں کو کتاب صورت میں شائع کروانے سے بھی گریز کرتے رہے۔یہ دوستوں کی مہربانیاں تھیں کہ ان کے شعری مجموعے ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کا پہلا ایڈیشن 2003ء میں شائع ہوا اور سال بھر میں ہی اس کا دوسرا ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آ گیا۔بعد میں ان کے پنجابی افسانوں کا مجموعہ ''بڑی دیر ہوگئی'' بھی 2004ء میں منصۂ شہود پر نمودار ہوا جس میں 25 کہانیاں شامل ہیں۔پنجابی کہانیاں لکھنے کی ابتدا اتفاقاً ریڈیو کے اسلام شاہ کے کہنے پر ہوئی۔اس سے پہلے 1970ء میں اظہر جاوید نے انگریزی میں لکھی گئی بلغاریہ کی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا جس کی بہت زیادہ پذیرائی ہوئی۔اس بارے میں خود اظہر جاوید کہتے ہیں:۔

> ''میرا ہمیشہ توں ایمان رہیا اے کہ ہر کم دا وقت مقرر ہوندا اے.....کدی وہم گمان وچ نہیں ہوندا تے کجھ آپ ہو جاندا اے تے کدی تر لے کر دیاں سکھدیاں عمراں لنگھ جاندیاں نیں، تے کوئی خاہش پوری نہیں ہوندی.....''

اظہر جاوید کی پیدائش 4 جنوری 1938ء کو راول پنڈی پاکستان میں ہوئی۔ان کو ادب ورثے میں ملا تھا۔تایا اور ایک چاچا نامور ادیب تھے مگر علم کی دولت انہوں نے اپنے ننھیال سرگودھا میں حاصل کی جہاں ہر دوسرا آدمی تعلیم یافتہ تھا۔خود ان کی ماں بھی کانونٹ سے تعلیم یافتہ تھیں جو اس دور کے مسلم معاشرے میں بعید از قیاس تھا۔وہ اپنے بیٹے کو سی ایس پی بنانے کے حق میں تھیں مگر کاتبِ تقدیر نے کچھ اور ہی لکھا تھا۔ماں کی نجی لائبریری بیٹے کو بحرِ علم میں غوطہ زن ہونے کی تحریک دیتی رہی۔گفتگو، رکھ رکھاؤ، اور سلیقہ مندی بھی ماں کی ہی دین تھی۔اپنی ماں کی محبتوں اور عظمتوں کا اعتراف انہوں نے اپنی نظموں 'بلاوا' اور 'رُکون

بتائے؟' میں بڑے جذباتی انداز میں کیا ہے۔ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

''بیٹا واپس گھر آ جاؤ/ ماں غم سے بے جان ہوئی ہے/ رو رو کر ہلکان ہوئی ہے/ گھر کا گھر سونا ہے سارا/ ہر اک شے ویران پڑی ہے/ گم صم سی حیران پڑی ہے/ خوشیوں کا سیندور لٹا ہے/ سکھ کا سورج ڈوب چلا ہے/ بیٹا گھر واپس آ جاؤ.....'' (بلاوا)

''مائیں کیوں مر جاتی ہیں/ شفقت، رحمت برکت والے/ پیار کے گھر میں/ سکھ آنگن میں/ چاہت سے مہکے گلشن میں/ پت جھڑ کیوں بھر جاتی ہیں/ مائیں کیوں مر جاتی ہیں.....'' (کون بتائے)

اظہر صاحب اسکول ہی میں شاعری اور نثر لکھنے کی طرف مائل ہوئے تھے البتہ صحافت کی جانب انہیں الطاف مشہدی نے بعد میں راغب کر دیا جب انہوں نے 1955ء میں ہفتہ وار 'خلوص' شائع کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن یہ رفاقت زیادہ دیر نہیں نبھ سکی کیونکہ بقول اظہر جاوید ان کا اپنا لاابالی پن اور اضطرار اس باہمی رفاقت کے آڑے آیا۔ 1969ء میں 'تخلیق' کی ابتدا پہلے کتابی صورت میں ہوئی اور پھر باضابطہ اردو اور پنجابی کے مشترکہ ماہنامہ کے طور پر ہوئی اور یہ سفر تادمِ آخر جاری رہا۔ ماہنامہ ''تخلیق'' کا گیٹ اپ خود اظہر صاحب کی شخصیت کو منعکس کرتا رہا۔ رسالہ ہمیشہ مقدار (Quantity) پر معیار (Quality) کو ترجیح دیتا رہا۔ اس رسالے کے ساتھ ساتھ وہ لاہور اور کراچی میں چند ادبی اور فلمی رسالوں خاص کر 'امروز' لاہور اور 'حریّت' کراچی سے بھی منسلک رہے۔ 'امروز' کی نوکری کے دوران ہی وہ پنجابی صحافت سے جڑ گئے البتہ انہیں 1983ء میں حکومت کا عتاب جھیلنا پڑا اور سات سال بے روزگاری اور جبر سے روبرو ہونا پڑا۔ بقول اظہر صاحب :

''روٹی روزی کے بکھیڑوں، تخلیق کو چھاپتے رہنے کے انتظامات، بے معنی قسم کی کالم نگاری اور وغیرہ وغیرہ نے کبھی سنجیدگی سے اپنی شاعری کے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیا۔''

اظہر جاوید کی شاعری میں عشق و محبت بھی ہے اور رومانس بھی، ہجر و وصال بھی ہے اور تنہائی کا احساس بھی، عصری آگہی بھی ہے اور بیتے ہوئے کل کی بازگشت بھی۔ ان کے تخیل کی دنیا کبھی عینیؔ سجاتی ہے تو کبھی مومنؔ، کبھی لیلیٰ تو کبھی ناہیدؔ۔ ان کے ساتھ بتائی ہوئی چند گھڑیاں شاعر نے بڑی خوبی سے اپنی نظموں 'کچھ غم سہی، کچھ خواب سہی'، 'فیصلہ'، 'جانم'، 'جدائی کے بعد' 'پرانی محبوبہ کے لیے نئی نظم'، 'جانم کے لیے'، اور 'میرے بعد' میں پیش کی ہیں۔ نظم 'اگر' میں شاعر کو محبوب کی بے وفائی نے اتنا قنوطی بنایا ہے کہ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ اگر دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔

''میرا ایمان ہے پھر بھی/ تمہارے دل کی دنیا میں/ میری خاطر محبت کا کوئی لمحہ نہ اُترے گا/ کوئی جذبہ نہ اُبھرے گا۔''

اسی طرح 'نظم' جو ''تم عجیب لڑکی ہو'' سے شروع ہوتی ہے میں شاعر یہ سمجھ نہیں پاتا کہ وصل کی شدید چاہت کے باوجود اس کی محبوبہ کیسے ضبط کر پاتی ہے۔ ایک نظم جس کی ابتدا ''بہت دنوں سے کوئی شعر بھی نہیں لکھا'' سے کی گئی ہے، اسی میں شاعر نے

ذہنی تعطل(Writers block) کی عکاسی بڑی ہنرمندی سے کی ہے۔'شہزادی اور غلام' میں شاعر یاقوت جیسے غلاموں، جو تاریخ کے پنّوں کی زینت بن چکے ہیں، کی قسمت کا رونا یوں روتے ہیں:۔

''مگر اِن غلاموں کی قسمت یہی ہے/کسی شاہزادی سے منسوب ہوکر/ فقط چند لمحوں کو محبوب ہوکر/تو تاریخ کے خالی سطحوں کو بھرنا۔''

شعری مجموعے''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' کے چنیدہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جو اپنے آپ سے ہم نے چھپا کے رکھے تھے
نہ جانے کون چرا لے گیا وہ خواب سبھی

کوئی بھی وعدہ نہیں ہے اس کا، اس کے باوجود
ایک بے ترتیب سی یہ دوستی اچھی لگی

سجاؤ اپنے کمرے میں کبھی جب پھول نرگس کے
تو اتنا سوچ لینا منتظر کوئی تمہارا ہے

وصل کا لمحہ، خوشی کا پل، وفا کی چاشنی
کس کی قسمت میں یہ اظہر سکھ کی سوغاتیں ہوئیں

شہرت، عزت، چاہت، راحت، کچھ بھی اپنے پاس نہیں
کچھ یادیں، کچھ بہتے آنسو، اپنا کُل سرمایہ ہے

میں نے اس کو اب کے خط میں خالی کاغذ بھیجا ہے
دیکھے گی، کچھ سوچے گی اور شاید وہ رو دے گی

آوارگی کا شوق نہیں، المیہ ہے یہ
گھر ہے نہ کوئی گھر میں ہمارا ہے منتظر

خود سے باتیں کرتے ہیں ہم، میں اور میرا پاگل پن
دُکھ سے دامن بھرتے ہیں ہم، میں اور میرا پاگل پن

شام ہوئی سب بنجارے، سب پنچھی گھر کو لوٹ چلے
کاش! کوئی میرا بھی گھر ہو، کاش کبھی گھر جاؤں میں

سوکھ جائیں پھول تو پھر تتلیاں رہتی نہیں
روکھے پھیکے عشق سے خوش لڑکیاں رہتی نہیں

نظم 'جدائی کے بعد' میں شاعر نے اشاروں اشاروں میں ایک بچھڑے ہوئے محبوب کی مجبوریوں اور معذوریوں کی جس خوبی سے تجسیم کی ہے اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

تم نے اپنے البم سے، اپنے گھر کی دیواروں سے
میری ہر تصویر کو جب جب نوچا ہوگا، جانے کیا کیا سوچا ہوگا (نظم جدائی کے بعد)

اسی طرح شاعر نے 'اعتراف' میں اپنے محبوبہ کی ان محبتوں اور عنایتوں کا اعتراف سچے من سے کیا ہے جن کی بارش محبوبہ نے اس وقت کی تھی جب زندگی کی جدوجہد میں شاعر کو نامرادی اور ناکامی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

''میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں/تم نے اس وقت مجھ کو تھاما تھا/ زندگی مجھ سے جب گریزاں تھی/ ایک پُر ہول کرب طاری تھا/موت آنگن میں یوں غزل خوان تھی/غم کی یورش تھی دل کی دنیا میں/ ہر مسرت بھی مجھ سے لرزاں تھی۔'' (نظم اعتراف)

چند اور نظموں کا ذکر یہاں پر ضروری ہے۔'ایک نظم۔سرگودھا کے لیے' میں ناسٹلجیائی کی کیفیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

اس نظم میں شاعر کی پہلی محبوبہ کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں جس کی جدائی کے غم میں شاعر نے اس شہر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا تھا۔ نظم 'تشکیک'' میں شاعر اپنی شاعری کے توسط سے عرفانِ ذات اور عرفانِ حقیقت کے سمندر میں غوطے لگانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ نظم 'خوشبو' میں وہ خوشبو کے جوہر کو قلم بند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اظہر کی شاعری اپنے معاشرے کو بھی آئینہ دکھاتی ہے۔ یہ کہیں انسان کی بے مروتی پر خندہ زن ہوتی ہے اور کہیں ان ہجرتوں کا نوحہ پیش کرتی ہے جو فرقہ واریت، مذہبی فسطائیت، دہشت گردی اور اقتصادی استحصال کا ثمر ہوتی ہیں۔ دہشت گردی کے حوالے سے شاعر کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

جفا کے سرد جھونکوں نے/ کیا ہے دل کو اب چھلنی/ یہ ہونی تو نہیں ٹلنی/
چلو پھر کوچ کر جائیں/ وہ جن کے واسطے زندہ تھے/ ان کے ہی اشارے پر/
کہیں پردیس کی بے مہر دنیاؤں میں مر جائیں (ہجرت)

عجب بھگدڑ مچی ہے کس سے پوچھوں — کہاں سب لوگ دوڑے جا رہے ہیں
ہم بے گھر یہ کیسے جانیں، گھر گھر موسم اچھا ہے — دل بستی آباد اگر ہو پھر ہر موسم اچھا ہے
نفرتوں کے دریا ہی پاٹنے ہوئے مشکل — چاہتوں کے ساگر تو کب سے پار کر بیٹھے
وہ جو آج مرا ہے اندھی گولی سے — اس کی ماں نے بھی تو دعائیں مانگی تھیں
میں لہروں سے لپٹ کر سو تو جاؤں — میرے اندر کا ڈر مرتا نہیں ہے
چمکتے دیکھا تھا اک برق کو گلستاں میں — پھر اس کے بعد جو دیکھا تو آشیاں گم ہے
صدا دوں کس کو، دستک دوں کہاں وہ در نہیں ملتا — سفر سے لوٹ کر آیا تو اپنا گھر نہیں ملتا
ہمدردی کی باتیں سُن سُن اب یہ خواہش ہوتی ہے — اتنے سارے اپنوں میں اے کاش کوئی بیگانہ ہو

اظہر جاوید کی زبان شستہ، عام فہم اور رواں ہے۔ وہ گنجلک استعاروں اور کنایوں کا استعمال نہیں کرتے۔ البتہ سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کی طرح ان کی زبان میں پنجابیت کا خاصا دخل نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں غلام فرید ''دل اوتھے دیئے .....'' کا اقتباس پیش خدمت ہے:

پیار محبت، چاہت راحت سب ہونی کے کھیل — کب ہو گا سنجوگ دلوں کا، جانے کب ہو میل
دل کے ہاتھوں خوار ہوئے ہیں، پل بھر میں فرزانے — غلام فرید دل اوتھے دیئے جتھے اگلا قدر پچھانے

بلاشبہ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ان کے فن پر ایم۔اے پنجابی کا مقالہ لکھا جا چکا ہے مگر اُردو دنیا ابھی تک نامور شاعر، نثر نگار اور صحافی اظہر جاوید کو نظر انداز کرتی رہی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ موصوف کی شخصیت اور کارناموں پر جلد ہی تحقیق شروع ہو گی اور اردو ادب اور صحافت میں ان کے مقام کا تعیّن ہو گا۔

اظہر جاوید کی یاد میں

اکرام تبسم

مجھے اس فقرے سے اتفاق نہیں جو ہمارے کالم نگاروں نے بار بار لکھا کہ ''اظہر جاوید اب اس دنیا میں نہیں رہے'' وہ ہم میں اسی طرح موجود ہیں جیسے وہ پہلے تھے۔ ایک سچے صحافی کی طرح، ایک خوب صورت نظم نگار کی شکل میں، ایک مدیر کی حیثیت سے اور ایک عمدہ غزل کے مصرعوں کی مانند جس میں تمام تر جمالیات اور رومانیت گُندھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ان چاہنے والوں کے دلوں پر اب بھی حکومت کر رہے ہیں جن کے محبت بھرے خطوط ان کی ''انجمنِ خیال'' میں شامل ہوتے تھے۔ یہ خطوط آپ کو اب بھی ان کے ادبی مجلّہ ''تخلیق'' میں ملیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ خطوط ان کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کو آج بھی اگر ہم سنجیدگی سے پڑھیں تو آپ کو ایک جیتی جاگتی زندگی سے واسطہ پڑے گا۔

ایک اور بات جو اظہر جاوید کی زندگی کا ہمیشہ حصہ رہی ہے، وہ ہے ان کی ''انا'' جو اس دور میں بڑے بڑے لوگوں میں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اظہر جاوید نے اپنا سر ہر حال میں اپنے کندھوں پر رکھا دوسروں کے کندھوں پر نہیں اور نہ ہی دوسروں کی طرف دیکھا جب کہ انہوں نے اپنی زندگی میں مشکل ترین حالات سے مقابلہ کیا۔ ''امروز'' سے نکالے جانے کے بعد بے روزگاری کی زندگی سے مسائل پیدا ہوئے ہوں یا مارشل لا کی بدترین بندشوں کی شکل میں سامنے آئے ہوں انہوں نے کسی کے آگے سر نہ جھکایا اور نہ کسی حکومت کے آگے ہاتھ پھیلایا اور نہ ہی سرکاری مدد کو قبول کیا۔ ''تخلیق'' بھی اپنی محنت سے شائع کیا اور تسلسل کے ساتھ شائع کیا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے نام ایسے ملیں گے جنھوں نے ہر سانس سرکاری امداد اور دیگر وسائل سے لی ہے اور پھر دنیا کے سامنے سر نہ اُٹھا سکے۔ اظہر جاوید کا سر کبھی سرنگوں نہیں ہوا۔

''تخلیق'' کی وساطت سے ہی میری اظہر جاوید سے آشنائی ہوئی۔ یہ بات 1984ء کی ہے جب میرے بھائی مرغوب علی انڈیا سے پاکستان آئے اور اظہر جاوید سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ میری ذمہ داری میں شامل تھا کہ میں ان کو لاہور کے ادیبوں سے ملاقات کراؤں کیوں کہ وہ ان گلیوں، بازاروں سے واقف نہ تھے۔ اور نہ ان کی ملاقات پاکستانی شعراء اور ادیبوں سے پہلے تھی۔ بس ان کے پاس چند رسائل کے ایڈریس تھے اور کچھ نام تھے جن میں ظفر اقبال، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، عطا الحق قاسمی، خالد احمد، امجد اسلام امجد اور بہت سے ناموں کے ساتھ اظہر جاوید اور ''تخلیق'' کا نام بھی شامل تھا۔ میں نے سب سے پہلے قرعہ ''تخلیق'' کے دفتر کا نکالا۔

ہم جب اظہر صاحب کے دفتر ''بھگوان سٹریٹ'' پہنچے تو اظہر صاحب نے بڑی محبت اور چاہت سے ہمارا سواگت کیا اور اس انداز سے ملے جیسے برسوں سے میل ملاقات ہو۔ مرغوب بھائی ان سے پاکستانی ادب اور اظہر صاحب ہندوستانی ادب کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور میں اظہر صاحب کی معلومات پر حیران ہوتا چلا گیا کہ یہ شخص پاکستان رہ کر وہاں کی اتنی معلومات رکھتا ہے۔ بہت سے احباب سے مرغوب علی کی ملاقات کرانے کی ذمہ داری اظہر صاحب نے اپنے ذمہ لے لی اور ایک تقریب شیزان ہوٹل مال روڈ پر منعقد کر ڈالی۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میری پہلی تخلیق اظہر جاوید کے جریدے میں اشاعت پذیر ہوئی۔ مرغوب صاحب واپس انڈیا چلے گئے لیکن میں اظہر کے پاس رہ گیا اور اپنی غزلوں نظموں کے مشورے بھی ان سے ہی لیتا رہا۔ ان ہی کے دفتر میں میری پہلی ملاقات حبیب جالبؔ سے ہوئی۔ جو اپنی سچی، سیدھی سادی بات کرنے کی وجہ سے خاصے مشہور تھے۔ بس اس کے بعد کیا تھا کہ ان دونوں احباب سے میری بہت گہری دوستی ہوگئی۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ان دونوں احباب نے میری ابتدائی رہنمائی کی جو آج تک میرے لیے مشعلِ راہ ہے اور میں اس میدان میں ٹھہرا ہوا ہوں۔

اظہر جاوید کو ادبی تقریبات کرانے کا شوق تھا۔ وہ جب بھی کوئی تقریب منعقد کراتے تو اپنے ادبی دوستوں کو ضرور مدعو کرتے۔ ان کی ہر تقریب میں خوب صورتیاں اور رنگینیاں باقی سب تقریبات سے زیادہ ہوتیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حسن ان کی ہمیشہ کمزوری رہی ہے۔ خواتین بھی ان پر اعتماد کرتیں۔ جب کوئی ان سے مسکرا کر بات کرتا تو اظہر صاحب کے چہرے کی رنگت اور نکھر جاتی۔ کیوں کہ بنیادی طور پر اظہر صاحب جمال پسند تھے۔ تقریب میں ہر شخص کے پاس جاتے دل کھول کر ملتے اور شکریہ ادا کرتے۔ اظہر جاوید کو دشمنی پالنا کبھی نہیں آیا۔ جب کہ اپنی سچائی اور لگی لپٹی کے بغیر بات کرنے کی وجہ سے بہت سے ادیب ان سے ناراض بھی رہتے تھے لیکن ان کی طبیعت میں ناراضگی کا عنصر نہ تھا، اگر چار لفظ کوئی کہہ بھی دیتا تو مسکرا کر ٹال جاتے اور اگلے لمحے اس سے یوں باتیں کر رہے ہوتے جیسے کبھی کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ ان کی آواز میں محبت، ملائمت اس قدر تھی کہ ہر شخص کو ''پیارے'' ہی کہہ کر پکارتے۔

ان کا تعلق بیرونِ ممالک کے ادیبوں سے بھی تھا۔ جن سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا مگر وہ اپنی فقیری میں خوش رہے اور ان کو مشاعروں میں جانے کا بھی کوئی خاص شوق نہ تھا کہ وہ مشاعرے کرانے والوں کے نخرے اٹھاتے۔ جب کہ ان کے اردگرد تمام شعراء اس کوشش میں رہتے کہ کوئی ان کو یورپ کا ویزا بھیج دے اور مشاعرہ پڑھوا دے لیکن اظہر صاحب اس سے بے نیاز رہے اور اپنی تمام زندگی خودداری میں گزار دی۔ انھوں نے کبھی بھی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا ایک اور کمال یہ تھا کہ وہ اپنا پرچہ باقاعدگی سے بذریعہ ڈاک ارسال کرتے۔ یہ وصف پاکستان کے بڑے بڑے مدیروں میں نہیں ہے۔ آج وہ دنیا میں نہیں لیکن ہمارے دلوں میں دھڑک رہے ہیں۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔

◆◆◆

تمام عمر بسر کی تو.....

تسنیم کوثر

یہ عمر عزیز جو بظاہر ہمیں بہت طویل دکھائی دیتی ہے لیکن حادثہ یہ ہے کہ پل بھر میں بیت جاتی ہے اور زندگی موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور.....رنج والم کی پرچھائیاں پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

موت کی آغوش میں دبک جانے والے تو شاید آسودہ ہو جاتے لیکن بہت سے دلوں کو دائمی ملال میں ڈال جاتے ہیں۔

لاہور کی ادبی فضا.....ان دنوں حزن و ملال سے بھر گئی ہے۔''تخلیق'' کا زرّیں عہد ختم محسوس ہوا۔اظہر جاوید سے چالیس بیالیس برس کی رفاقت چھوٹ گئی ہے۔آسمانِ ادب پر جو ستارہ بڑی آب وتاب سے چمک رہا تھا وہ اپنی روشنی میں گُم ہو گیا ہے۔الم ونشاط سے گُندھی یہ شخصیت راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔آہ!اظہر جاوید چل بسے۔

اظہر جاوید جیسے لوگ ایسے شہابِ ثاقب ہوتے ہیں جو اپنی ہی تابانی کی زد میں رہتے ہیں۔آسمان ان ستاروں سے عموماً نامتفق ہی رہتا ہے۔انہیں ایک عمر، آسمان در آسمان نقل مکانی کرنا ہوتی ہے۔

نقل مکانی اظہر جاوید کا مقدر ٹھہری مگر ان کا مقصدِ اولیٰ ہمیشہ ''تخلیق'' رہا۔اس مقصد سے انہوں نے کبھی انحراف نہیں کیا کہ یہ ان کے وجود کا دوسرا حصّہ تھا جو بے ثبات نہیں۔

زندگی کو کسی خاص مثبت مقصد کے تحت گزارنے اور پھر ساری زندگی اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کے جینے والے لوگ خوش قسمت بھی ہوتے ہیں کہ طمانیت انہیں میسر آ جاتی ہے اور اپنے کام اور کارکردگی کے حوالے سے وہ اپنا ایک منفرد مقام بنا لیتے ہیں۔اظہر جاوید بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔''تخلیق'' سے انہیں عشق تھا۔''تخلیق'' ان کی زندگی تھی۔

ان کی ''تخلیق'' سے لگن، اس کے ادبی معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی خواہش میں کبھی کمی نہیں آئی اور پھر وہ اس مقام پہ آ گئے جہاں دل و جان کی کاوشیں، سرزمینوں کو نمو اور شادابی بخشتی ہیں۔اظہر جاوید نے 'تخلیق' کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور پھر جیسے اپنی عمر ''تخلیق'' کے ساتھ ہی بسر کی، خود کو وقف کر دیا 'تخلیق' کیلئے۔اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ جی جان

سے انہوں نے اس پودے کی آبیاری کی، اسے ایک تناور گھنا شجر بنایا اور نئے اور پرانے سب لکھنے والوں کو اس کی چھاؤں سے مستفید کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ''تخلیق'' کا کنبہ بڑھتا ہی رہا۔ بزرگوں کے گزر جانے کے باوجود ایک نیا کارواں مرتّب ہوتا چلا گیا۔ فرد سے کارواں بننے تک کا سفر آسان نہیں ہوتا کہ یہ راہیں کٹھن اور طویل ہوا کرتی ہیں مگر اظہر صاحب نے اپنا یہ سفر بڑے تحمّل سے طے کیا، وہ آبلہ پائی پر بلبلائے نہ مژگاں جنوں آثار سے کبھی کوئی آنسو ٹپکنے دیا..... ہاں یہ ضرور ہوا کہ رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو میں کرب کی آمیزش ہوتی گئی لیکن پھر بھی ان کی باتوں سے خوشبو پھوٹتی تھی اور شاعری سے درد چھلکتا تھا۔ ''اپنی بات'' ہمیشہ دُکھ میں بھیگی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' اور ''بڑی دیر ہوگئی اے'' پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ان میں ہر سُو کرب ہی کرب بکھرا ہُوا ہے۔ دُکھوں کو چھپا کر، لب پہ ہنسی سجا کے جینا مشکل ہوتا ہے مگر اظہر جاوید ایسے ہی جیئے۔

اظہر جاوید کو مختلف لوگ، مختلف حیثیتوں سے جانتے ہیں جیسے ان کی ایک باعظمت عمارت جو ہر زاویے سے اپنی ایک جداہئیت اور انداز رکھتی ہے اور ہر نگاہ اس عمارت کے مشترک حسن کا احاطہ کرتی ہے۔ اُن کی وضع داری، ملنساری، مہمان نوازی اور انسان دوستی، ان کے ہر ملنے والے کو اپنے حصار میں لئے رکھتی تھی۔

ان کی طویل ادبی خدمات کی قدر زمانے پہ واجب ٹھہری۔ انہیں جیتے جی بھی سراہا گیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں پرائڈ آف پرفارمنس دینے کا اعلان ہوا مگر صد افسوس، یہ ایوارڈ لینے تک وہ جیئے ہی نہیں۔

جھٹ پٹ سناؤنی آ گئی اور..... وہ اپنے دائمی گھر کو چل دیے۔

قریبِ قبر ہم آئے، کہاں کہاں پھر کے
تمام عمر بسر کی تو اپنا گھر دیکھا (انیس)

ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک اس فرشِ خاکی نے ان گنت انسانوں کے نقشِ پا اپنی جھولی میں سمیٹے اور پھر انہیں اپنا رزق بنایا۔ اظہر جاوید بھی اب ان میں شامل ہو گئے ہیں مگر ''تخلیق'' ان کے نقشِ کو معدوم نہیں ہونے دے گا۔ وہ اس دنیا میں تخلیق کے وسیلے سے جگمگاتے رہیں گے۔

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

ترکِ تعلق کر تو بیٹھا، لیکن اب اس سوچ میں ہوں
اُس کو بُھلانا آساں ہے یا اپنا جینا مشکل ہے

گوشۂ اظہر جاوید

منور سلطانہ بٹ

شہر لاہور دا سب توں وکھرا، سوہنا ڈیرہ اُجڑ گیا!

پنڈی دے وچ جمیا سی اوہ سرگودھے دا جایا سی
شہر لاہور دے وِچ اَوس نے ''تخلیق'' دا ڈیرہ لایا سی

نیڑیوں دوروں لوکیں اوسدے ڈیرے اُتے آوندے سن
دل دیاں گلّاں، اپنے دُکھڑے آ کے سب سناوندے سن

سب دے اتھرو پونجدا سی اوہ پیار تسلّیاں دیندا سی
دُکھڑیاں اگے ڈٹ جانے دی گل اوہ سب نوں کہندا سی

رنگاں دا اوہ جانو سی تے خوشبوواں دا والی سی
پیار محبتاں والے پُھلاں، بوٹیاں دا اوہ مالی سی

اکلاپے دا ماریا سی پر غماں کولوں نہیں ڈر دا سی
پنج ویلے اوہ سوہنے پیارے رب نوں سجدا کردا سی

ہتھاں اُتے سَرَوں جما کے ویکھو اگے اپڑ گیا
شہر لاہور دا سب توں وکھرا، سوہنا ڈیرہ اُجڑ گیا!

حسین شاد (ہالینڈ)

اظہر جاوید دی نذر

اوہ دل دی کتھا سناندا سی
اوہ پیار دے شہر وساندا سی
اوہ ادب دا خدمتگار وی سی
اوہ کنے دُکھ ونڈاندا سی

O

اوہدے ڈیرے لگدے میلے سن
اوتھے ہیراں والے بیلے سن
اوتھے موسم مٹھّیاں گلاں دے
اوہنے ادب دے بیڑے ٹھیلے سن

O

اوہ اپنی لِیہ دا پکا سی
اوہدا وعدہ ہر اک سچا سی
اوہنے کدی وی ہمّت ہاری نئیں
اوہدا کم نہ کوئی کچا سی

O

پئی آکھے ٹہنی ٹہنی اے
اوہدی یاد تے زندہ رہنی اے
اوہدا شعر ادب وچ نام وی سی
ایہہ گل تے منّی پینی اے

O

اوہ سجناں دا غم خوار وی سی
اوہ بندہ طرح دار وی سی
اوہ اظہر سی اوہ روشن سی
اوہ شاد دا پکا یار وی سی

گوشۂ اظہر جاوید

سوالنامے کی روشنی میں

سیما پیروز

O سونان اظہر جاوید: ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید سے آپ کی ملاقات کب ہوئی؟ اس ملاقات کے تاثرات لکھئے۔

☆ **سیما پیروز :** اظہر جاوید سے نوے کی دہائی میں ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات نے ہی بڑے خوشگوار تاثرات چھوڑے۔ وہ اتنے خلوص اور اپنائیت سے ملے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ پیروز چونکہ سروس کے دوران جوہر آباد اور سرگودھا رہ چکے تھے۔ اس لیے اظہر جاوید بہت خوش ہوئے اور سرگودھا کی باتیں کرتے رہے پھر ان لوگوں کے کچھ مشترکہ جان پہچان والے اور دوست نکل آئے جوہر نظامی اور شکیب جلالی کی باتیں کرتے رہے پھر انہوں نے اپنے لڑکپن کی کچھ یادیں تازہ کیں۔ ہم جب اُن کے آفس سے نکلے تو ان کی محبت اور خلوص کی خوشبو بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلی آئی۔

O ''تخلیق'' میں آپ کی پہلی ''تخلیق'' کب شائع ہوئی ہے۔ اس ادب پارے کا عنوان لکھیے اور ''غزل'' ہے تو مطلع لکھیے۔

☆ ''تخلیق'' میں میری پہلی تحریر شائد 1992ء میں شائع ہوئی۔ افسانے کا نام مجھے بالکل یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ میری دوسری کتاب کی کوئی کہانی تھی۔

O ''آپ کی ''تخلیقات'' کب تک اس پرچے میں چھپتی رہی ہیں۔''

☆ ''میری آخری کہانی 2010ء میں چھپی۔''

O ''ان تخلیقات پر اظہر جاوید کے تاثرات لکھیے۔''

☆ ''وہ بہت کم اظہار کرتے تھے۔ اگر کوئی خط تعریف یا ناپسندیدگی کا آجاتا تو خوب مذاق اڑاتے جیسے جگن ناتھ آزاد نے انڈیا سے میری کہانی کی پسندیدگی کا خط لکھا۔ وہ خط بھی مجھے دے دیا اور اکثر مذاق اڑاتے۔ اب تو انڈیا کے ادیب تعریفیں کر رہے ہیں۔''

O کیا آپ کی تخلیقات پر ''انجمنِ خیال'' میں لکھنے والوں نے بھی اظہارِ خیال کیا؟

☆ اکثر اظہار خیال ہوتا تھا۔ زیادہ تر کہانیوں کی تعریف ہوتی۔ ایک بار حکیم سعید نے میرے افسانے کو بولڈ لکھا اور حیرت کا

اظہار کیا کہ خاتون نے کہانی لکھی ہے۔

O ''اظہر جاوید سے آخری ملاقات کا حال لکھیے۔''

☆ ''اظہر جاوید سے آخری ملاقات 13 رفروری کو جم خانہ میں ہوئی۔ چائے کے بعد میرے پاس آ کر بیٹھے۔ میرا اس وقت بلڈ پریشر ہائی تھا اور میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کہنے لگے مانا کہ آج آپ اچھی لگ رہی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غریب غربا سے بات ہی نہ کی جائے۔ میں اور فوزیہ تبسم ہنسنے لگے میں نے بتایا کہ میرے حسن کا راز بلڈ پریشر ہے۔ پیروز تسنیم کوثر کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔ مجھے کہنے لگے لو وہ دیکھو اپنے میاں کو، کیسے کھلے جا رہے ہیں۔ میں ہنس پڑی۔ ''چلو انہیں بھی تھوڑی دیر خوش ہو لینے دیں۔ پھر پیروز کو گرم جوشی سے دیر تک گلے ملے اور کہنے لگے کہ جمعہ کو تسنیم منٹو کے ہاں کھانے پر ملاقات ہوگی۔''

O ''اظہر جاوید سے روابط کے دوران کوئی یادگار واقعہ؟''

☆ ''واقعات تو ڈھیر سارے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ سرگودھا سے میری ایک دوست شوکت افضل آئی ہوئی تھیں۔ وہ بھی رائٹر ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کسی ادبی پرچے کے ایڈیٹر سے ملوانے کو کہا۔ میں انہیں اظہر جاوید کے پاس لے گئی۔ بہت اچھی طرح ملے۔ چائے پلائی، سرگودھا کی کافی باتیں ہوتی رہیں۔ بی بی کا حدود اربعہ پوچھا گیا۔ کافی دیر کے بعد جب ہم رخصت ہونے لگے تو شوکت افضل نے الوداعی کلمات میں شکریہ ادا کیا۔ اظہر جاوید اس تمام عرصے میں سراپا عجز اور گل و گلزار بنے ہوئے تھے لیکن جونہی شوکت افضل نے کہا: ''اچھا بھائی صاحب چلتے ہیں۔ انشا اللہ آئندہ ملاقات ہوگی''۔ اظہر جاوید ایک دم ایسے اچھلے جیسے بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔ نہایت کٹھور پنے سے اس کی بات کاٹ کر بولے ''معاف کرنا بی بی مجھے بھائی کہلوانا بالکل پسند نہیں''۔ اور چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ اب آپ دفع ہو جائیں۔ میں اور شوکت دونوں ہکا بکا آفس سے باہر نکل آئے۔ یہ الگ بات کہ بعد میں فون پر میری اور ان کی اسی بات پر کافی گرما گرمی ہوگئی اور کئی مہینے ہماری بول چال بند رہی''۔

.....

منور سلطانہ بٹ

O **سونان اظہر جاوید:** ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید سے آپ کی ملاقات کب ہوئی؟ اس ملاقات کے تاثرات لکھیے۔''

☆ **منور سلطانہ بٹ :** یہ ایک دو نہیں کوئی اٹھائیس برس پرانی بات ہے۔ میں گوجرانوالہ میں مقیم تھی۔ بی۔اے کی طالبہ تھی اور اُن دنوں شعر سخن کے چمنستان میں داخل ہو چکی تھی۔ 23 فروری 1984ء کو ''بزمِ شمعِ ادب، گوجرانوالہ'' (جس کے کرتا دھرتا ڈاکٹر محمود، شیخ آفتاب اور جان کاشمیری تھے) نے ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت کے لیے جناب اظہر جاوید کو لاہور سے گوجرانوالہ مدعو کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے میں پہلی بار ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی

ہنس مکھ طبع، دل نشیں لہجے اور خوبصورت شخصیت کی وجہ سے کسی بھی انسان کو پہلی ملاقات میں ہی اپنا گرویدہ کر لیتے تھے۔

O ''تخلیق''میں آپ کی پہلی ''تخلیق'' کب شائع ہوئی ہے۔اس ادب پارے کا عنوان لکھیے اور ''غزل'' ہے تو مطلع لکھیے۔''

☆ ''تخلیق'' میں میری پہلی غزل تو 1984ء کے ہی کسی شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ بہت تلاش کرنے کے باوجود وہ شمارہ نہیں مل سکا۔اس لیے اپنے پاس موجود سب سے پرانے شمارے اپریل 1990ء میں شائع شدہ غزل کا مطلع پیش ہے:

اب بے قراریوں کے موسم نہیں رہے ہیں
اختر شماریوں کے موسم نہیں رہے ہیں

O ''آپ کی ''تخلیقات'' کب تک اس پرچے میں چھپتی رہی ہیں۔''

☆ ''1984ء سے لے کر 2011ء تک ''تخلیق'' کے ساتھ ادبی رشتہ استوار رہا۔کبھی کبھی درمیان میں وقفے حائل ہو جاتے تھے۔لیکن یہ سلسلہ کبھی ٹوٹا نہیں اور میری شاعری اُردو پنجابی دونوں کا بیشتر حصہ ''تخلیق'' میں شائع ہوا۔''

O ''ان تخلیقات پر اظہر جاوید کے تاثرات لکھیے۔''

☆ جناب اعزاز احمد آذر نے میری کچھ غزلیں اپنی کتاب ''آنچل پہ لکھی غزل'' میں شامل کی تھیں۔اُن پر جو کچھ اظہر صاحب نے لکھا وہ درج ہے:

''سلطانہ منور (منور سلطانہ بٹ) نے عورت کی تمام شائستگی اور تہذیب کی شاعری کی ہے اور نسائی احساسات کو نیا حُسن اور بانکپن دیا ہے۔ وہ الگ درجہ بندی کی کوشش کیے بغیر پورے شعری ماحول میں شامل ہو کر بھی اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے ہیں۔یہی اُن کی وڈیائی بھی ہے اور یہی شعری اعجاز بھی۔''

(اظہر جاوید)

O ''کیا آپ کی تخلیقات پر ''انجمنِ خیال'' میں لکھنے والوں نے بھی اظہارِ خیال کیا؟''

☆ ''جی ہاں! جب کسی کو کوئی شعر اچھا لگتا تھا تو ''انجمن خیال'' میں اس کی داد دی جاتی تھی۔''

O ''اظہر جاوید سے آخری ملاقات کا حال لکھیے۔''

☆ ''اظہر صاحب سے آخری ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی۔دراصل وہ دن ہی یادگار تھا۔4 جنوری اظہر جاوید کی سالگرہ کا دن۔ یہ لگ بھگ کوئی بیس اکیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں ایک دن دفتر ''تخلیق'' میں داخل ہوئی تو وہاں پر جناب ولی الرحمٰن ناصر (مرحوم) اور جناب زمان کنجاہی کو کیک کے ساتھ موجود پایا۔استفسار پر پتہ چلا کہ آج اظہر جاوید صاحب کی سالگرہ ہے۔اُنہوں نے کہا کہ میں تو کسی کو نہیں بتاتا۔ان بے وقوفوں (وہ قریبی دوستوں کو پیار سے کبھی کبھی بیوقوف کہہ دیا کرتے تھے) کو پتہ نہیں کیسے خبر ہو گئی ہے۔ یہ دن انہیں یاد رہتا ہے اور یہ کیک لے کر آ جاتے

ہیں۔ پھر ہم تینوں کی تالیوں کی گونج میں اظہر جاوید صاحب نے سالگرہ کا کیک کاٹا اور مبارک بادیں وصول کیں۔ اُس دن کے بعد میں نے بھی اس دن کو ہمیشہ یاد رکھا۔ کچھ قدرت نے بھی اس دن کو یاد رکھنے کے لیے مزید اہتمام کر دیا۔ 1994ء میں میری شادی ہوگئی۔ قدرت نے مجھے اکلوتی بیٹی عطا کی۔ میری بیٹی ظواہر بٹ 5 جنوری کو پیدا ہوئی۔ میں بیٹی کی سالگرہ کا اہتمام کرنے سے ایک دن پہلے اظہر صاحب کو مبارک باد دینے ضرور جاتی۔ وہ بھی اپنی سالگرہ سے دوسرے دن فون کر کے ظواہر کو مبارکباد دیتے اور کہتے ''بٹو تم مجھ سے صرف ایک دن چھوٹی ہو۔ دیکھ لو کل میں پیدا ہوا اور آج تم''۔ اظہر صاحب دوستوں کے بچوں کو بھی بے حد پیار کرتے تھے وہ بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتے تھے۔ بچے بھی اُن سے مل کر بے حد خوش ہوتے تھے۔ میں بات کر رہی تھی اظہر جاوید صاحب کی سالگرہ کی۔ 4 جنوری 2012ء کو میں کیک، پھول اور ایک خوبصورت سا پھول دان لے کر گئی۔ شام کا وقت تھا سحر حفیظ اُن کے پاس بیٹھی تھی۔ بڑے خوش ہوئے، سحر سے مخاطب ہوئے دیکھو دوست ایسے یاد رکھتے ہیں۔ پھر میری اور سحر کی تالیوں کی آواز میں اظہر جاوید نے کیک کاٹا۔ میں نے اور سحر نے مبارک باد دی۔ میں نے کہا اظہر صاحب آئندہ برس آپ پچھتر برس کے ہو جائیں گے۔ آپ کی پچھترویں سالگرہ پر تمام احباب کو اکٹھا کریں گے اور وہ سالگرہ خوب زور شور سے منائیں گے۔ لیکن کسے خبر تھی کہ صرف ایک ماہ دس دن بعد وہ اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں گے۔ یہ اُن کی آخری سالگرہ اور میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد صرف فون پر رابطہ رہا۔

O ''اظہر جاوید سے روابط کے دوران کوئی یادگار واقعہ؟''

☆ واقعات تو بے شمار ہیں لیکن یہاں آخری واقعے کا تذکرہ کروں گی۔ اظہر صاحب جتنے ہنس مُکھ اور شوخ طبع تھے اُس قدر حساس بھی تھے۔ دوستوں کے دُکھ درد کو بھی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ 2011ء کی بات ہے میں کچھ مہینوں سے دفتر ''تخلیق'' نہ جا سکی تھی۔ وجہ میری طبیعت کی ناسازی تھی۔ پہلے پہل تو میں نے اُنہیں نہیں بتایا لیکن ایک دفعہ سرسری سا ذکر ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب بیلے کے سفید پھولوں کا گلدستہ تھامے مجھے بغیر اطلاع اچانک آ گئے۔ یہ دسمبر کے آخری عشرے کی ایک صبح تھی اور اظہر صاحب کی میرے گھر میں آخری تشریف آوری۔''

O '' ''تخلیق'' کی بیالیس سالہ صحافتی زندگی پر تبصرہ کیجئے۔''

☆ '' ''تخلیق'' کی صحافتی زندگی ادب کی روشنیوں سے منور ہے۔ اس رسالے نے نہ صرف اپنے قارئین کے ادبی ذوق کو تسکین بہم پہنچائی بلکہ علم و ادب کے بے شمار طالب علموں کے لیے بہترین راستے متعین کیے!''

◆◆◆

اظہر جاوید

SMS کے جواب میں!

سوال ہو تو کوئی، پھر جواب لِکھیں ہم
خزاں کے پھول کو کیسے گلاب لکھیں ہم

کوئی ارادہ نہ وعدہ، نہ کوئی قول قرار
تو کس تمنا پہ چاہت کا باب لکھیں ہم

محبتوں کی شریعت میں شرط ہوتی نہیں
جو دل نے چاہا ہے، اُس کو ثواب لکھیں ہم

کبھی مِلی، جو کبھی فون پر دیا پیغام
ہمیشہ بخشا ہے اک اضطراب، لکھیں ہم

مزاج اُس کا معمّہ، رویّہ پیچیدہ
اُسے ہواؤں میں اُڑتا سحاب لکھیں ہم

وہ جانتی ہے کہ فطرت ہے کیسی صحرا کی
دکھائے ہم کو بھی کیا کیا سراب لکھیں ہم

نہ چاندنی کبھی بخشی اُداس راتوں کو
مگر یہ شوق، اُسے ماہتاب لکھیں ہم

خیال میں تو سجائے ہیں رنگِ قوسِ قزح
تکے ہیں ذہن نے جو جو بھی خواب لکھیں ہم

اُسے یہ ضِد ہے کہ جھیلا ہے اُس نے ہجر بہت
سہے ہیں ہم نے بھی کیا کیا عذاب لکھیں ہم

نہ کوئی مکتبِ اُمید ہے نہ درسِ وفا
تو کس بھروسے پہ دل کا عذاب لکھیں ہم

وہ جن کا دعویٰ ہے بے گھر ہیں، اُن کو کیا معلوم
یہاں بھی رہتے ہیں، خانہ خراب لکھیں ہم

وہ ایک بار اگر بازوؤں میں لے لیتی
حسین شعروں کی تازہ کتاب لکھیں ہم

OOO

☆ جناب اظہر جاوید کی یہ نظم سمندر پار سے ایک خاتون نے خصوصی طور پر ''تخلیق'' کو بھجوائی۔ ادارہ ''تخلیق'' ان کا شکرگزار ہے اور ان کے ارشاد پر ان کا نام صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔

اظہر جاوید

بس پیار کرو

کب تک اپنے جذبوں سے انکار کرو گی
مُجھ سے کیا تم خود سے بھی تکرار کرو گی
جذبے تو سیلابوں جیسے ہوتے ہیں
کوئی رکاوٹ، کوئی بند ہو رستے میں
اُس کو بہا کر لے جاتے ہیں
سوچوں اور ارادوں کی
جتنی فصیلیں ہوتی ہیں
اُن کو پل میں ڈھاتے ہیں

جذبوں کو تم روکو گی تو
اک اُلجھن ہو گی جی میں
پھر نام تمہارا آئے گا
ناکامی ہی کے قصے میں

جذبوں کو سلامت رہنے دو
جو خود پہ ڈھاتی رہتی ہو
بے نام قیامت رہنے دو
جو دل میں ہے اظہار کرو
جو دبی دبی سی خواہش ہے
تُم اس کا اب اقرار کرو
بس پیار کرو.....بس پیار کرو

OOO

اظہر جاوید

انجانا ڈر

کِس کِس در پہ دستک دی ہے، اپنا گھر معلوم نہیں
کیسے بے گھر ہوئے تھے، کیسے خاک بہ سر، معلوم نہیں

کہاں گئیں رومانی شامیں، سنیما، تھیٹر، ریستوران
کیوں ہے اِک انجان سا، اَن دیکھا ڈر معلوم نہیں

اس نے تقدس اوڑھ لیا اور کب کا ہم کو چھوڑ دیا
اب اُس کے زانو پہ ہو گا کس کا سر، معلوم نہیں

ہم نے پیار کی دولت پائی اور قناعت کر بیٹھے
کیسی ہوس میں بھٹک رہے ہیں اہلِ زر معلوم نہیں

ہم نے اہلِ دل سے سیکھا، خیر کی برکت بانٹا کرو
لوگ مگر کیسے رکھتے ہیں دل میں شر، معلوم نہیں

زندہ ہیں تو کس نے اظہؔر خوشیوں سے سیراب کیا
مر جانے پر کِس کی آنکھیں ہوں گی تر معلوم نہیں

OOO

نیا سلسلۂ محبت

دوستوں کے دوست۔اظہر جاوید کے خطوط ـــــ معاصرین کے نام

اظہر جاوید بنام یوسف سہیل شوق صاحب

29 جون 1993ء کا ''الفضل'' دیکھا۔ستار طاہر صاحب مرحوم کے بارے میں آپ کا مضمون پڑھ کر پہلے مَیں اور بعد میں بیگم ستار طاہر حیرت زدہ رہ گئے۔

آپ عرصے سے مجھے جانتے ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں اہلِ سُنت میں سے ہوں اور حنفی العقیدہ ہوں۔اس وضاحت کی ضرورت اس لئے محسوس کی ہے کہ مرحوم ستار طاہر سے میری کم وبیش تیس سال سے دوستی تھی۔بہت ابتدائی برسوں میں اسے مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔تب میں بھی نماز نہیں پڑھتا تھا مگر داتا گنج بخش کے مزار پر باقاعدگی سے جاتا تھا اور اہلِ نجوم اور تصوف اور روحانیت کا دعویٰ کرنے والوں کے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ستّار طاہر اس قسم کے تکلّفات سے آزاد تھا۔

میرا مزاروں پر حاضری دینے کا معاملہ اتنا معروف ہے کہ جب دو برس پہلے میں جناب قتیل شفائی کے ساتھ بھارت گیا تو وہاں حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نظام الدین اولیا اور حاجی بابا کی درگاہوں پر حاضری دیتا رہا۔قتیل صاحب یہ سب پسند نہیں کرتے تھے' مگر وسیع المشرب ہونے کی وجہ سے میرے شوق کو دیکھتے رہتے تھے۔

ستّار طاہر بھی میرے خیال میں وسیع المشرب تھا۔مگر زندگی کے آخری برسوں میں وہ بھی روحانیت اور تصوف کی طرف مائل ہو گیا تھا۔شرقپور کی درگاہ اور چُورا کی خانقاہ کے علاوہ وہ سالار والا (فیصل آباد) کے بزرگ صوفی برکت علی کے پاس بھی جاتا تھا۔اس کی وفات کے بعد بیگم ستّار طاہر نے بتایا ہے کہ وہ داتا دربار پر بھی حاضری دیتا تھا۔اس نے کچھ عرصے سے اپنی ہر تحریر کے اُوپر 'الودود' لکھنا شروع کر دیا تھا۔یہ بھی کسی صوفی کی ہدایت پر ہُوا تھا۔اشفاق احمد نے اُس کی وفات کے بعد بتایا کہ یہ اُن کے ڈیرے کا (نور والا ڈیرہ لاہور) وِرد ہے۔

ہمارے درمیان تصوف کی باتوں اور کتابوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔میں اب پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں' ستار طاہر کو یہ عادت نہیں رہی۔لیکن اگر رات کو دیر تک اُس کے گھر میں نشست ہوتی تو وہ خود مجھے جائے نماز بچھا کر دیتا۔میں نماز قضا کرنے کا

عادی نہیں وہ کوئی بھی ''مشغلہ'' کرتا' میں نہیں ٹوکتا تھا۔ وہ میرے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔ یہ سب باتیں خصوصیت سے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مجھے احمدیت کے بارے میں جتنی معلومات ہیں' اس کے مطابق کوئی احمدی مزاروں' درگاہوں اور خانقاہوں پر نہیں جاتا۔ میری معلومات میرے دوستوں' حیدر قریشی' لطیف قریشی اور عبدالکریم خالد صاحبان کے وسیلے تک محدود ہیں۔ اور میری معلومات کے مطابق احمدی حضرات تصوّف کے پیروکار نہیں ہوتے۔

آپ نے لکھا ہے کہ ستار طاہر کو عبدالرشید تبسّم نے اس جماعت سے متعارف کروایا۔ عبدالرشید تبسّم ہم سب کے دوست تھے مگر اُن کے سگے بھائی عبدالقدیر رشک کا دعویٰ ہے کہ وہ (رشک صاحب) احمدیت چھوڑ چکے ہیں۔ حیرت ہے' تبسّم صاحب نے اپنے سگے بھائی کی بجائے ایک دوسرے شخص پر توجہ دی۔

میں نے ابھی حیدر قریشی کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی احمدیت چھوڑ کر بہائیت کا مسلک اپنا چکے ہیں۔ اسی طرح جناب پیام شاہجہان پوری کہتے ہیں کہ اُن کے بھائی تو احمدی ہیں' وہ خود نہیں۔ میں یہ حوالے اس لئے دے رہا ہوں کہ کیا اگر کوئی شخص احمدی ہوتا ہے یا احمدیت چھوڑتا ہے تو آپ کی جماعت میں اس کا کوئی اعلان یا اطلاع ہوتی ہے؟

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ستار طاہر نے آپ کی جماعت کے امام صاحب (شاید آپ کا اشارہ مرزا ناصر الدین محمود صاحب کی طرف ہے) کے ہاتھ پر 1983ء میں بیعت بھی کر لی تھی۔ اسی مضمون میں آپ نے لکھا ہے کہ لاہور کے کسی ادیب پر ستّار طاہر کے احمدی ہونے کا انکشاف ہوا تو اُس نے دوسرے اہلِ قلم اور صحافیوں کو خطوط لکھے۔ میری طرح کنول فیروز صاحب بھی ستار طاہر کے نہایت دیرینہ دوستوں میں سے ہیں۔ انہیں بھی اس واقعے کے دونوں حصوں کا علم نہیں۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ ستار طاہر کا عبدالرشید تبسّم سے بہت تعلق تھا اور یہ بھی بجا ہے کہ وہ اکثر راتوں کو بھی اُن کے ہاں ٹھہر جاتے تھے۔ میں نے آپ کے مضمون کی اشاعت کے بعد جناب راجہ غالب احمد سے ستّار طاہر کے احمدیت قبول کرنے کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ بھی لاعلم ہیں۔ میرا خیال ہے احمدیہ جماعت میں راجہ غالب احمد کی حیثیت کافی اہم ہے۔ میرا سوال پھر وہی ہے۔ کیا کوئی شخص جب احمدیت اختیار کرتا ہے تو جماعتی سطح پر اس کا اعلان نہیں ہوتا؟ ''الفضل'' پڑھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے' احمدیہ جماعت کے ہر کام کا ایک نظام ہے' ترتیب ہے اور جماعت کا ہر فرد دوسرے کے ساتھ گُتھا ہوا ہے۔

کسی کی بیعت کو خفیہ کیوں رکھا جاتا ہے.....؟ یہ تو دین کی بات نہ ہوئی' دُنیاداری ہوگئی۔ پھر جب بقول آپ کے..... کسی شخص کو معلوم ہو گیا کہ ستار طاہر احمدی ہو گیا ہے (اُسے کیسے معلوم ہُوا.....؟) تو پھر اخفاء کا تکلّف بے معنی ہو گیا اور خود ستار طاہر نے ایسا کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ نے اپنے تئیں مضمون پوری احتیاط سے لکھا ہے اور اس میں جھوٹ کا کوئی کھوٹ نہیں۔ مگر میں اپنے ایک قدیم دوست کے بارے میں، جو اَب مرحوم ہو چکا ہے اور جسے سمجھنے اور جاننے کا مجھے دعویٰ ہے' اس انکشاف کی تفصیل اور تصدیق چاہتا ہوں۔ کیا آپ کے ہاں بیعت کرتے وقت کوئی ریکارڈ رکھا جاتا ہے' جسے شہادت اور ثبوت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہو؟

میں پھر آپ سے اپنی واقفیت کے ناتے سے بات کروں گا۔ آپ سے جب بھی ملاقات ہوئی ہے' گفتگو ہوئی ہے' یا آپ کے ہمارے مشترکہ دوستوں کی محفل اور سنگت اس بات کے گواہ ہیں کہ میں نہ تنگ نظر ہوں نہ مین میخ نکالنے والا۔ کوئی کیا ہے' یہ میرا معاملہ نہیں۔ اس کام کو مُلا اور مولوی نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ میرا معاملہ میرے خُدا' میرے رسولؐ اور ان کی کتاب کی ہدایات تک ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ستار طاہر مرحوم کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ اُنہوں نے اسی معاشرے میں پلنا بڑھنا ہے اور پھر شادیاں کرنی ہیں۔ ہم جس ''خوفناک'' معاشرے اور ''المناک'' زمانے سے گذر رہے ہیں، یہاں تو ہر چیز کو نہایت مختلف ترازو میں تولا جاتا ہے' کیا کل کلاں کو یہ بات اُن پر اثر انداز نہیں ہوگی؟ اور ایک سوال یہ بھی ہے' کہ اگر ستار طاہر کی بیعت کو مخفی رکھنے کا عہد ہو چکا تھا تو ان کی موت کے بعد اس معاملے کو کیوں سامنے لایا گیا.....؟ یہ سوال زیادہ اہم ہے۔ یوسف سہیل شوق صاحب! مجھے توقع ہے کہ آپ اپنے جواب سے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

..... رب راکھا' آپ کا.....اظہر جاوید

17-07-1993

اظہر جاوید بنام ڈاکٹر انور سدید

آپ پھر وعدہ خلافی کی زد میں آنے کو ہیں۔ جتنی مہلت آپ نے مانگی تھی وہ تو تمام ہوئی۔ اب میرا کام بھی تمام کریں۔ کاتب میرے پیچھے لگا ہُوا ہے۔ (صد افسوس..... یہ وقت بھی مجھ پر آنا تھا)۔ عید سے پہلے کتابت ختم ہو تو اُس کا حساب شروع ہوگا۔ آپ اُس غریب پر ہی ترس کھائیں۔

اور کیا لکھوں..... کہ لکھنا تو دراصل آپ کا کام ہے۔ ہم تو پڑھتے ہیں اور لطف لیتے ہیں۔ ویسے اس بار جو افسانہ نگاروں کی فہرست آپ نے بنائی اور جو ایک دو ناموں کے علاوہ سب پر سیاہی پھیری' یہاں اس کا ''چرچا'' بہت ہے اور ہاں یاد آیا..... آپ نے تو لاہور آنا تھا۔ میں اُس دن بہت منتظر رہا بلکہ تابش صاحب بھی انتظار کرتے رہے۔ احباب کو آداب!

..... رب راکھا' آپ کا.....اظہر جاوید

03-08-1973

اظہر جاوید بنام نارنگ ساقی صاحب

پاکستان پہنچے کئی دن (بلکہ ہفتے) ہو گئے ہیں مگر آتے ہی یہاں کی بے ترتیبی کو سنوارنے کی کوشش میں' خود میں بے ترتیب ہوتا گیا۔ ہمیشہ کی طرح آپ نے محبتوں اور نوازشوں سے سرشار کیا۔ میں رِند ہوں نہ مے خوار ہوں' آپ تو مسلّمہ ساقی ہیں' آپ نے تو مسرّتوں اور راحتوں کی مے کی بوچھاڑ کرنا ہی ہوتی ہے۔ چلتے چلتے آپ نے دوسرے تحائف کے ساتھ جو گراں قدر رسالے دیئے تھے' اُنہوں نے بھی خاصا مصروف رکھا۔

بڑے بھائی صاحب سے طے کیا تھا اور وعدہ لیا تھا کہ اس بار نہ آپ اپنے انڈیا کے دورے کا چرچا کریں' نہ ہماری

سُن گن کسی کو دیں.....انہوں نے ''حسبِ عادت'' وہاں سے پاکستان میں جو فیکس بھیجے ہیں' اس میں میرا بھی ذکر ہے اور ساتھ ایک شاعرہ کا بھی ..... میں نے کسی دوست کو خبر نہیں کی تھی۔ چلیئے اُن کی تو خیر ہے' معافی تلافی ہو جائے گی۔ اگر باقی حسیناؤں کو پتا چل گیا (اور جلد چل جائے گا' بڑے بھائی کی مہربانی سے) تو میرا تو چل چلاؤ ہوگا۔ میری خوش فہمی ہے کہ میں آپ کو ''سمجھ دار'' سمجھتا ہوں۔

قتیل شفائی' لاہور میں نچلّے بیٹھنے والے نہیں۔ بیچ میں دو ہفتے آسٹریلیا گزار آئے ہیں۔ کہتے تھے کہ وہاں انہیں کوئی ایوارڈ ملنا تھا مگر پاکستانیوں کا خیال ہے کہ کرکٹ ورلڈ کپ جیتنے والی ٹیم کو مبارک دینے گئے تھے۔ واپس آ گئے ہیں اور اپنی بات پر قائم ہیں۔ اب یقیناً انڈیا کے لئے تیاریوں کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے' اُدھر سے بلاوا تو ہے ہی' کوئی مشاعرہ یا اُس کا دعوت نامہ آ جائے تو گھر والوں کے سامنے سُرخ رو ہو جائیں۔

دِلّی والوں نے میرے ساتھ وہی سلوک شروع کیا ہے' جو پرانے زمانے میں خود دِلّی کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ آپ کا خط آ جاتا ہے یا ظہیر ناصر جواب دے دیتے ہیں۔ آں جہانی دلیپ قاعدے سے باقاعدگی نبھاتے تھے۔ کیول دھیر لگتا ہے' غم کے گہرے سمندر سے ابھی نکلا نہیں۔ دوستوں کو چھوڑیں۔ گھر میں بچوں کو پیار دیں اور بھابی جی کو آداب پہنچائیں۔

..... رب راکھا' آپ کا.....اظہر جاوید

16-07-1999

اظہر جاوید بنام ملک مقبول احمد صاحب!

آج آپ کی دی ہوئی کتابوں کو ''بیسویں صدی کی اُردو شاعری'' اور ''ایک صدی کے افسانے'' (مصنّف دونوں کتابوں کے انور سدید ہیں) اپنے دفتر آ کر جستہ جستہ دیکھا۔ بڑے دھچکے لگے' بہت جھٹکے کھائے۔ صاحبِ من! پروف ریڈنگ کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ آپ کا ادارہ مثالی ہے۔ انور سدید صاحب کا نام بھی مستند ہے۔ یہ خرابی نہیں ہونی چاہیئے۔

ایک پیش کش! آئندہ اس قسم کی' خصوصاً انور سدید صاحب کی کتابوں کی میں بلا معاوضہ پروف ریڈنگ کر دیا کروں گا..... بلا معاوضہ پر غور فرمائیں۔ اصل میں آپ کے اور انور سدید صاحب کے ''تخلیق'' اور مجھ پر بہت احسانات ہیں' کچھ تو بوجھ میں بھی ہلکا کروں.....تکلّف نہ فرمائیں' آزما کر دیکھ لیں۔ شاد آباد رہیں!

..... رب راکھا' آپ کا.....اظہر جاوید

27-01-2011

اظہر جاوید بنام منزہ افضال صاحبہ

سمجھ میں نہیں آتا' کیا لکھوں' کیسے لکھوں! آپ جس گہرے دُکھ میں گھری ہیں' اس کے بارے میں صرف سوچا جا سکتا ہے' آپ کا کرب محسوس نہیں ہو سکتا۔ میں ملنا چاہتا ہوں..... پتا نہیں آپ کس حال میں ہوں..... میں تو شاید آپ کو تسلّی دیتے

ہوئے خود بھی پھوٹ پڑوں۔کیا آپ عِدّت نبھا رہی ہیں؟ کیا میں آپ سے اپنے عزیز دوست کا غم بانٹنے آ سکتا ہوں؟ اگر ممکن ہو تو کسی بچے سے فون کروا دیں.....میں افضال کے چہکتے ہوئے گھر میں آ کر کچھ دیر بلکنا چاہتا ہوں۔جس بندے کا معالج غم زدہ ہو، اُس کے رفیقوں کا کیا عالم ہوگا؟

رب راکھا.....افضال اور منزہ کا ایک غم زدہ دوست.....اظہر جاوید

06-02-2012

(یہ افضال شاہد کی وفات پر اظہر جاوید کے غم کا اظہار ہے۔صرف ایک ہفتے کے بعد 14 رفروری کو اظہر جاوید عقبیٰ میں افضال شاہد (مرحوم) سے ملنے کے لیے اس دنیا سے اُٹھ گئے.....ادارہ)

◆◆◆

''تخلیق'' لاہور اور راولپنڈی میں مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہوگا

لاہور

ایسٹ بُک سنٹر

6-B، دی مال لاہور۔ (فون:042-38543006)

شرافت نیوز ایجنسی

ٹورسٹ سٹریٹ، مدینہ مسجد، چوک پرانی انارکلی۔لاہور (فون: 0300-4766734)

.....

راولپنڈی

ورائٹی بکس سٹال

ورائٹی بکُس، بنک روڈ، صدر۔راولپنڈی (فون: 051-5583397)

سمائل بکس ڈپو

سلیم شہزاد

نظم

اَنھے سُفنے
نیندر توڑی
نیندر نظماں لِکھیاں
نظماں وچوں
اَکھر نکلے
اَکھر گلاں کیتیاں
گلاں وچوں اتھرو
ڈُلھے
اَتھرو سُفنے ہوئے
اَکھر اگے
جنگل ہوکے
آخر سُفنے مَوئے

OOO

محمد جنید اکرم

کافی

ترساں تک تک تیریاں دَکھاں
ہر دم آس مِلن دی رکھاں
وے ماہی!
چھم چھم وَسّن اکھاں
وچ اُڈیک مَیں ہوندی جاواں
ہولی وانگن ککھاں
وے ماہی!
چھم چھم وَسّن اکھاں
رَت اپنی نال بال کے دیوے
اُچ ہنیرے رکھاں
وے ماہی!
چھم چھم وَسّن اکھاں
تیرے ورگا ہور نہ کوئی
میرے جہیاں لکھاں
وے ماہی!
چھم چھم وَسّن اکھاں
اُٹھدی بہندی ہر ساہ دے نال
زہر ہجر دا چکھاں
وے ماہی
چھم چھم وَسّن اکھاں

حسن اعزاز

O

کلم کلا اللہ سوہنا
سوہنا لگدا اللہ سوہنا

کِنے ای کم چھڈ دینا واں
کیہہ سوچے گا اللہ سوہنا

کدی کدائیں ہس لیا کر
کجھ نئیں کہندا اللہ سوہنا

اپنے آپ دے کولوں پُچھ لے
کیوں نئیں سُن دا اللہ سوہنا

OOO

منزہ شاہد

چھڈ اَڑیا

چھڈ اڑیا!
توُں.....
کیہڑے کیہڑے.....
پَھٹ نوں توپالاویں گا
ساڈا تے سارا پنڈا
لیرولیر ہویا
اسیں تیرا دین نئیں دے سکدے
توں ساڈی پیڑ پچھاتی اے
ساڈا درد ونڈانا چاؤنا ایں
پر ساڈی وی مجبوری اے
ایہ دولت ونڈ نئیں سکدے
ساڈا ایہ گُل سرمایہ اے
نہ پیار تروپے بھراڑیا!
نہ ویلا کھوٹا کراڑیا!
توں ساڈی فکر نہ کراڑیا!
جا سوہنیا.....
رب تیرا بھلا کرے

تبصرے

ادبی ڈائجسٹ (ضیاءالرحمان ضیاء)

مبصر : انور سدید

مقبولِ عام ڈائجسٹوں کی افراط کے دور میں اردو کے ممتاز شاعر اور دانشور جناب ضیاء الرحمان ضیا نے زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا انتخاب چھاپنے کے لیے کراچی سے ''ادبی ڈائجسٹ'' جاری کیا ہے جس کے چار شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر اس کا چوتھا شمارہ ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اُردو ادب کی اہم تخلیقی اصنافِ نظم و نثر کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ انگریزی رسالہ ''ریڈرز ڈائجسٹ'' کی طرز پر اُردو میں ڈائجسٹ چھاپنے کا خیال نصف صدی پہلے الطاف حسین قریشی کو آیا تھا اور انہوں نے لاہور سے ''اُردو ڈائجسٹ'' جاری کیا تھا۔ اس کی تقلید میں کراچی سے جو ڈائجسٹ رسالے نکلے ان میں ناول، افسانہ، تاریخ اور خودنوشت سوانح کو زیادہ اہمیت دی گئی اور ان میں تعلیم یافتہ خواتین کے ذوق کا خاص خیال رکھا گیا۔ ادب کا انتخاب رسالے کی صورت میں چھاپنے کا خیال ''نقوش'' کے مدیر محمد طفیل کو آیا اور انہوں نے ''روحِ ادب'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ جو زیادہ عرصے تک چل نہ سکا۔ دوسری کاوش شمس زبیری صاحب نے رسالہ ''نقش'' چھاپ کر کی۔ لیکن یہ بھی چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ ''ادبی ڈائجسٹ'' کے نام سے اب جناب ضیاء الرحمان ضیا نے رسالہ جاری کیا ہے تو انہوں نے قاری کے ذوقِ لطیف کو اعلیٰ معیار کے فراموش شدہ ادب پاروں سے سیراب کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اس کے ساتھ ہی پیشکش کے خوبصورت انداز سے اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین بھی کی ہے۔

''ادبی ڈائجسٹ'' شمارہ 4 (جون 2012ء) میں فوقیت افسانے کی صنف کو دی گئی ہے۔ اس میں خواجہ احمد عباس (سونے کی چار چوڑیاں)، انتظار حسین (سفرِ منزلِ شب)، بلونت سنگھ (چلمن)، بانو قدسیہ (لمبے سفر کا ساتھی)، نجم الحسن رضوی (دریا کا گھر)، احسان ملک (سمجھوتہ)، رئیس فاطمہ (خواب عذاب) کے افسانے شامل ہیں جو زندگی کے انوکھے زاویوں کو اُبھارتے اور ہماری سوچ کو مہمیز کرتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوا کہ آج جو افسانہ کثرت سے لکھا جا رہا ہے وہ

سابقہ دور کے ان افسانوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا اور ہر افسانے کے مطالعے کے بعد جناب ضیاء الرحمان ضیا کے ذوقِ انتخاب کی داد دینے کو جی کرآتا ہے۔

شاعری کے حصّے میں منیر نیازی، غلام جیلانی اصغر اور بشریٰ اعجاز کی نظمیں شامل ہیں۔ اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، شان الحق حقی، باقی صدیقی اور جون ایلیا بھی غزل کے حصّے میں موجود ہیں۔ ان سب کی شعری تخلیقات سے ملاقات کر کے قاری کے احساس کو تازگی ملتی ہے اور فراموش شدہ اشعار پھر زبان پر رواں ہو جاتے ہیں۔ دلاور فگار کے قطعات وہ تازیانے ہیں جو اس شاعر نے اس دور کے معاشرے پر لگائے تھے لیکن آج بھی بالکل تازہ نظر آتے ہیں اور عبرت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔

سیّد ابوالخیر کشفی کے مضمون میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کو آزادی سے قبل کے دور سے برآمد کیا گیا ہے۔ اس میں مولوی صاحب کی ''طبعِ مزاح پسند'' کو بالخصوص اُجاگر کیا گیا ہے۔ سراج الدین ظفر کلاسیکی غزل کا نادر شاعر تھا۔ اس کی عظمتِ فن کو شمیم احمد نے ان کے دیوان ''غزال اور غزل'' سے بازیافت کیا ہے۔

''ادبی ڈائجسٹ'' (چہارم) میں ایک گوشہ ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید کی یاد میں مرتب کیا گیا ہے جو فروری 2012ء میں ہم سے جدا ہو گئے تھے۔ اس گوشے میں اظہر جاوید کی تخلیقات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بلغارین کہانی ان کی ترجمہ نگاری کا کامیاب نقش ہے۔ اظہر جاوید کی ایک پنجابی نظم کا ترجمہ ضیاء الرحمان ضیا نے اردو میں کیا ہے۔ اس حصے میں جناب ضیاء الرحمان نے اپنے نام اظہر جاوید کا پہلا خط (اگست 1967ء) اور آخری خط (فروری 2011ء) بھی شامل کیے ہیں، جو ظاہر کرتے ہیں کہ اظہر جاوید دوستوں کے دوست تھے اور نسبتیں قائم رکھنے والے انسان تھے۔ خورشید عالم سیّد کا مضمون اظہر جاوید کی یادوں پر مشتمل ہے۔ ایک جگہ انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ''اظہر جاوید کے گرد کچھ لوگ ایسے بھی جمع ہو گئے تھے جو اپنے مقاصد کی خاطر مستقلاً رسالہ ''تخلیق'' کو استعمال کرنا چاہتے تھے اور بالآخر ایسے لوگوں نے انہیں احمد ندیم قاسمی سے لڑا کر چھوڑا۔'' یہ بیان حقیقت سے بعید ہے۔ خوشامدی ٹولہ درحقیقت احمد ندیم قاسمی کے گرد جمع تھا جس نے ''تخلیق'' کے اس اداریے کا غلط مفہوم قاسمی صاحب کے ذہن نشین کرایا جو اظہر جاوید نے فوجی صدر پرویز مشرف کے خلاف اور قاسمی صاحب کی حمایت میں لکھا تھا۔ قاسمی صاحب نے اظہر جاوید پر ازالہ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا اور اظہر جاوید کو عدالت میں کھینچ لے گئے تھے۔ ادبی دنیا کا یہ واقعہ تاریخ کا افسوس ناک باب ہے اور یہاں ریکارڈ کی دُرستی کے لیے لکھا گیا ہے۔ ''ادبی ڈائجسٹ'' 162 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف سو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ادبی ڈائجسٹ پبلشرز 504/A-3، الرؤف رائل سٹی، گلستانِ جوہر، بلاک-19، کراچی (75290) (فون:0300-2211187)

.....

سیر کر دنیا کی غافل (افسر سعید خان)

مبصر : انور سدید

''اس مختصر سی زندگی سے آرزو اور جستجو کا جذبہ منفی ہو جائے تو زندگی زندگی نہیں رہتی، کچھ اور ہو جاتی ہے۔ زندگی کا سارا عمل اس آرزو اور جستجو کا مرہونِ منّت ہے۔ انسان کے تجسّس نے اسے زمین و آسمان کی سیر کرائی - - - - - بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح جو ہمک ہمک کر ہر نئی شے کو چھونے اور پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔''

سیر و سفر کے بارے میں یہ بنیادی نکات زیرِ نظر کتاب ''سیر کر دنیا کی غافل'' کے مصنّف افسر سعید خان نے لکھے ہیں، جنہوں نے بقول جسٹس حاذق الخیری ''اکتالیس ملکوں کا دورہ کیا لیکن اس کتاب میں صرف گیارہ ملکوں پر قلم اٹھایا ہے۔'' پروفیسر سحر انصاری نے بتایا ہے کہ ''افسر سعید خان کا تعلق ریاست بھوپال سے ہے۔ شاعری، ادب۔ موسیقی اور محفل آرائی ان کے خاص شوق ہیں لیکن سب سے زیادہ لگاؤ انہیں سیر و سیّاحت سے ہے۔'' چنانچہ جب کبھی اپنے وطن کراچی میں مایوسی اور اُداسی ان پر حملہ کرتی وہ اپنا سفری بیگ کندھے پر ڈالتے اور گھر سے سیّاحت پر نکل کھڑے ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ زندگی کی اداسی، حالات کی مایوسی اور غیر متعیّن نظریات کا زنگ اُتر جاتا اور اس طرح ان کے دل کے دریچے ہی نہیں کھلتے بلکہ ذہن و دماغ کے زاویے بھی کشادہ ہوتے نظر آتے۔ ان کا اصرار ہے کہ وہ باقاعدہ مصنّف نہیں لیکن جس زیرک نگہی سے انہوں نے مختلف ممالک کو دیکھا اور پھر اپنی سیّاحت کے نقوش اس کتاب میں محفوظ کر دیئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے باطن میں مارکو پولو اور واسکوڈے گاما کی روح موجود تھی اور وہ یوسف خان کمبل پوش کی طرح وہ سب کچھ لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں جو ان کی زندہ اور متجسّس آنکھوں نے دیکھا۔

اس کتاب میں برطانیہ، فرانس، ترکی، بلجیم، ہندوستان، ہسپانیہ اور مصر وغیرہ گیارہ ملکوں کے سفرنامے پیش کیے گئے ہیں جن کی سیّاحت میں جناب افسر سعید خان نے اپنی زندگی کے انیس برس صرف کیے اور شوق کو راہنما کیا تو ہر ملک کی حیرتوں نے ان پر اپنی حقیقتیں کشادہ کر دیں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ مصنّف نے منظر کو جس انداز میں دیکھا اسی انداز میں پیش کر دیا ہے چنانچہ اس میں سچ کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے اور ''دروغ گوئی'' سے اجتناب کا احساس ہوتا ہے۔ میں اس کتاب کے سچے بیانیہ پر خوش ہو رہا تھا کہ اچانک افسر سعید خان کے معاصر سفرنامہ نگاروں کے بارے میں خیالات سامنے آ گئے۔ لکھتے ہیں :

''اگر آپ کو ملک بدر ہونے کا شوق صرف اس لیے پیدا ہوا ہے کہ آپ نے سفرناموں میں لکھی دلربا داستانیں پڑھی ہیں اور یہ امید باندھ کے جا رہے ہیں کہ جونہی دوسرے ملک میں قدم رکھیں گے، حسینوں کے جھرمٹ میں ہوں گے.....تو رختِ سفر کھولیے اور لمبی تان کر سو جایئے کیوں کہ ایسے حسنِ اتفاق ان سیاحوں کے ساتھ ہو سکتے ہیں جو گھر بیٹھے بیٹھے سفرنامے لکھتے ہیں اگر آپ کو حقیقت میں سیّاحت کا شوق

ہے تو گھِسی پٹی منزلیں کیوں؟ آپ ہمارے ہم سفر بنیں تو ہم آپ کو سیّاحت کی نئی منزلیں بھی دکھائیں گے اور سفر کے باعزّت طریقے بھی بتائیں گے۔ اس رفاقت میں ہماری پہلی منزل اندلس ہے اور جب تک ہمارا ساتھ رہا آپ مستنصر حسین تارڑ کی طرح یقیناً اُندلس میں اجنبی نہ ہوں گے۔''

اور میں آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ اس سفر نامے کے گیارہ ممالک میں میرے گائیڈ افسر سعید خان تھے اور انہوں نے اس سیّاحت میں مجھے ان تمام اشیا، مظاہر اور کرداروں اور تہذیبی نقوش سے ملوا دیا ہے جن سے ایک پاکستانی ملنے کی آرزو کر سکتا ہے۔ رہی سہی کسر اس کتاب کی تصویروں نے پوری کر دی ہے جو شنیدہ کو دیدہ بنا رہی ہیں۔ ضخامت 416 صفحات، قیمت 400 روپے۔ ملنے کا پتہ..... 403۔اے، صائمہ سپرنگ فیلڈ، خلیق الزمان روڈ، کلفٹن، کراچی (فون: 0333-2202401)

.....

یادوں کی طاق پر رکھی کہانیاں (عذرا اصغر)

مبصّر : انور سدید

ڈاکٹر رشید امجد نے لکھا ہے کہ

''عذرا اصغر ایک منجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں، جنہیں کہانی بنانے اور کہنے کا فن آتا ہے۔ ایک طویل ریاضت نے انہیں افسانے کی نزاکتوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کے تصورِ وقت میں ماضی کو ایک خاص اہمیّت حاصل ہے اور اس حوالے سے یادیں اور یادوں کے تاثرات ان کی کہانی کا وہ جزو ہیں جو ان کی کہانی پر ان کی چھاپ لگاتے ہیں۔''

ڈاکٹر رشید امجد نے یہ رائے عذرا اصغر کے افسانوں کے نئے مجموعے ''یادوں کی طاق پر رکھی کہانیاں'' کے ''پیش لفظ'' میں دی ہے اور یہ رائے اس تاثّر کا تسلسل ہے جو ان کی پہلی کتاب ''پت جھڑ کا آخری پتہ'' کی اشاعت پر تشکیل پانا شروع ہوا تو ''بیسویں صدی کی لڑکی''..... ''تنہا برگد کا دُکھ'' اور ''گدلا سمندر'' تک پھیلتا چلا گیا اور ہر کتاب میں ان کے فن کی ارتقائی صورت کو سامنے لاتا رہا۔ اور انتہا یہ ہے کہ ان کی کتاب ''تیری آنکھوں کے ساتھ'' چھپی تو یہ تمام تر پرانی یادوں اور لاشعور کے خزینے میں محفوظ ماضی کی بازیافت پر مشتمل تھی اور اب زیرِ نظر افسانوں کی کتاب چھپی ہے تو اس کا انتساب ''گزرے ہوئے بے نیاز لمحوں'' کے نام کیا گیا ہے جو عذرا اصغر کا نہ صرف قیمتی اثاثہ ہیں بلکہ ان کی کہانی نگاری کی ایک جہت اور ان کے فن کی انفرادیت کو بھی متعیّن کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے عنوانات پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر دوڑائیں تو ''خواب اُدھورے''..... ''آنچل سے بندھی یادیں''..... ''دیوار پر لٹکتا کیلنڈر''..... اور اس کتاب کا عنوان متعیّن کرنے والا افسانہ ''یادوں کی طاق پر رکھی کہانی'' سب سے پہلے اپنی طرف متوّجہ کراتی ہیں کہ ان میں وہ ماضی اپنی حقیقی صورت میں موجود ہے جو حال کی سماجی ابتری میں امن و عافیت اور معاشرتی مسّرت کا گہوارہ تھا لیکن واضح رہے کہ یہ افسانے زمانۂ حال کے زبوں کیفیات کا بیانیہ بھی پیش کرتے اور قاری کی سوچ کا نیا در بھی

کھولتے ہیں اور خوش عنوان معاشرے پر بدعنوانی نے جو کالک بکھیر دی ہے، وہ نمایاں نظر آنے لگتی ہے۔ افسانہ ''ذرا سی بات'' میں کمپیوٹر سے اپنا پلاٹ نمبر نکلوانے کو تو اسی افسانے کے مرکزی کردار تقی صاحب نے بھی بُرا نہیں منایا لیکن معاشرتی گندگی اس وقت زیادہ پھیلتی ہے جب اس نوآبادخطّے میں رانا صاحب آ کر فروکش ہوتے اور پورے محلے کی مثالی فضا تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ اور پھر گلی کا مستقل ناسور بن جاتے ہیں۔ افسانہ ''دہشت گرد'' میں افسانے کی واحد متکلم خاتون، اخبار، ریڈیو اور ٹی وی پر نشر ہونے والی لوٹ کھسوٹ، موبائیل چھین لینے کی وارداتوں، عورتوں کے زیورات پستول رکھ کر لوٹ لینے کے واقعات اور اغوا برائے تاوان کی وارداتوں سے خوفزدہ اور سہمی ہوئی ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ اب اسے عقب سے آنے والا ہر شخص دہشت گرد نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں ماضی موجود ہے لیکن نظر نہیں آتا اور اسرار حال کے واقعات نے پیدا کیا ہے جو اندر کے موسم بادِ حوادث سے مسموم کر رہا ہے اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ معاصر افسانے میں عذرا اصغر اپنی انفرادیت تسلیم کرانے میں کامیاب ہیں۔ یہ کتاب معنویت کے اعتبار سے ہی نہیں صوری لحاظ سے بھی اہم اور دلآویز ہے۔ ضخامت 136 صفحات۔ قیمت 200 روپے۔ ملنے کا پتہ: دستاویز، سی 159، چناب بلاک نمبر 10، اقبال ٹاؤن۔ لاہور۔ مصنفہ کا پتہ..... عذرا اصغر۔ 14۔ رحمان ہاؤسنگ سوسائٹی۔ بی، او، آر جوہر ٹاؤن، لاہور۔ (فون: 0300-8839895)

.....

کب بیتے گا ہجر کا موسم

شاعر : افضال عاجز

صفحات : 128 قیمت : 150 روپے

پبلشر : پرائم ٹائم پبلی کیشنز' لاہور تبصرہ : آفتاب خان

افضال عاجز کی اس کتاب کے باطن میں اُترنے کے بعد اندازہ ہُوا کہ ان کی شاعری کسی الہڑ دوشیزہ کی شوخ و چنچل اداؤں جیسی ہے کیونکہ اس شاعری میں انہوں نے نہایت سادگی اور عمدگی سے محبت کو اُس کے تمام تر مظاہر کے پسِ منظر میں جانچنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے محبت کی ڈور میں جُڑے دلوں کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے اور ہر غزل' ہر نظم میں محبوب کے حُسن و جمال اور اُس کے خدوخال کو بطورِ خاص مصرعوں کے سانچے میں ڈھالا ہے جس کی وجہ سے زلف و گیسو' لب' رخسار' آنکھیں' کلائی اور بدن کے تمام زاویے اُن کے اشعار میں دَر آئے ہیں اور انہوں نے اِن تمام اعضائے حُسن و عشق کو بڑی خوبی سے اِس طرح شعروں کی زبان عطا کی ہے۔

بدن سے ایسے ترے پیرہن اُترتا ہے رُخ مہتاب سے جیسے گہن اُترتا ہے

.....

وہی ہیں پھر تری زُلفوں کے ملگجے سائے وہی رُتیں ہیں' وہی برشگال کا موسم

کہو صبا سے' اُنہیں چھیڑ کر نہ یوں گزرے خراش رُخ پہ اگر آ گئی تو کیا ہو گا

.....

تیرا چہرہ نظر آئے تو غزل کہتا ہوں اور تُو آنکھ ملائے تو غزل کہتا ہوں

''کب بیتے گا ہجر کا موسم'' میں جہاں جمالِ یار کے پُر کیف تذکرے ہیں وہاں ہجر وفراق کے نوحے بھی کپکپا رہے ہیں اور غمِ دنیا کے آلام وستم کا ذکر بھی جا بہ جا ملتا ہے۔ اور جب وہ اِس قسم کے حالات وواقعات سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں تو درد وحزن اور کرب کی کیفیت اُن کے مصرعے کے ہر لفظ سے آشکار ہوتی ہے صرف ایک شعر دیکھیں :

دن کٹ رہے ہیں ایسے مسلسل عذاب میں
تتلی کا جسم جیسے دبا ہو کتاب میں

افضال عاجز کی شاعری بلا شبہ اُن کے دل سے نکلی ہوئی ہُوک اور کُوک لگتی ہے جو کبھی کوئل کی طرح پیار بھرے گیت گاتی ہے اور کبھی قفس کی مانند اپنی ہی آگ میں جلنے والے دیپک راگ کا روپ دھار لیتی ہے۔

آئے نہ راس مجھ کو محبت کے چار دن اُڑنے کو تو اُڑا تھا مَیں اونچی اُڑان تک

.....

آخر ہم ہو کے خاک ہواؤں میں اُڑ گئے کب تک سلگتے رہتے بدن کے الاؤ میں

.....

رات بھر آتے رہے ہیں آندھیوں کے قافلے حادثوں کو بھی مرے گھر کا پتا اُس نے دیا

الغرض افضال عاجز کے زیرِ نظر شعری مجموعہ کا مطالعہ کرنے والے کو یہی محسوس ہو گا کہ یہ اُس کی اپنی وارداتِ قلبی ہے جسے افضال عاجز نے شعروں کا روپ عطا کر دیا ہے۔

.....

حصارِ نظر

مصنف : نجیب عمر

صفحات : 240 قیمت : 240روپے

پبلشر : الحمد پبلی کیشنز' کراچی تبصرہ : آفتاب خان

افسانہ نگاری ایک مشکل فن ہے اس لیے افسانہ لکھنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں جبکہ شاعر حضرات کی بھرمار ہے۔ نجیب عمر اس لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے ادب کے میدان میں رہنے کے لیے افسانہ نگاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب ''حصارِ نظر'' میں نجیب عمر کے افسانوں کا موضوع آج کا انسان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تاریخی واقعات کو بھی کہانی یا افسانے کا روپ دیا ہے۔ ''موہنجوڈرو' سیاہ گلاب' شانی' رانی کی پکار' اندر کی دستک' نگینہ اور نگینہ

شناس، عشق ومشک، کلپنا، مضطرب، ضمیر کا قیدی، مزارِ قائد کے سائے میں اور تحریر سے تصویر تک''۔ان کے فن کے آئینہ دار ہیں۔

نامور افسانہ نگار شمشاد احمد ان کے بارے میں کہتے ہیں ''نجیب عمر کی کہانیوں کی ایک خوبی ان کی ریڈایبلٹی (Readability) ہے۔ ہر کہانی خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے جیسے کمان سے چھوٹا تیر، غیر ضروری جزیات سے پاک، کفایت لفظی کا احترام۔''

.....

حُسنِ دیپک

شاعر : ڈاکٹر طاہر سعید ہارون

صفحات : 212 قیمت : 400روپے

پبلشر : سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور تبصرہ : آفتاب خان

دوہا نگاری کرنے والے شاعر موجودہ عہد میں خال خال ہی نظر آتے ہیں مگر طاہر سعید ہارون وہ دوہا نگار ہیں جو مسلسل اِس صنف کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔اب ان کا یہ دوہا نگاری پر مبنی نوواں مجموعہ منظر عام پر آیا ہے اور ان 9 مجموعہ جات میں اُن کے تقریباً آٹھ ہزار دوہے شامل ہیں، جسے ایک ریکارڈ ہی کہا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب انسان، کائنات، زمین اور اُس کی دائمی قدروں سے ذہنی طور پر وابستہ ہیں اور انہیں انسانی رنج وآلام اور مسرت ونشاط کے سبھی رنگوں سے آشنائی ہے۔اِسی لیے انہوں نے انسان سے جُڑے ہر سلسلے اور ہر موضوع کو اپنے دوہوں کا حصہ بنایا ہے۔حمد، نعت، دُعا، قرآن اور دیس کے علاوہ انہوں نے جن موضوعات کو چُنا ان میں گیان، جھوٹ، سچ، ناری، من رانجھنا، بوگ، ناگ، جل ساگر، دھرتی، اماوس، چاندنی، پھلواری، پنکھ پکھیرو، گاؤں، غریب، چرخہ، سُر تال اور دیگر کئی عنوانات کے تحت لفظوں کے موتی دوہے کی شکل میں بکھیرے ہیں۔چند دوہے ملاحظہ کیجئے :

چاہے گرو گرنتھ ہو گیتا یا قرآن داعی ہیں سب پیار کے سمجھے تو انسان

.....

خاک ہوئی من کوٹھری چار دشائیں راکھ ناری تیرے پیار میں کھو دی اپنی ساکھ

.....

کیا مُکھیا، کیا چودھری، کیا رانا، کیا رائے سارے ہیچ غریب پر کرتے ہیں انیائے

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے دوہوں میں پیار محبت کی چاشنی بھی ہے اور انسانیت کی تڑپ بھی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔بلاشبہ انسان سے محبت کیے بغیر اور اُس کے دکھ درد کی رمز سے آشنا ہوئے بغیر اِس قسم کا کلام لکھنا ناممکن ہے۔

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ محترمی!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ ستمبر 2012ء نظر نواز ہوا۔ تازہ شمارہ اسی روایت پر کاربند ہے جس کی بنیاد اظہر جاوید مرحوم نے اپنی زندگی میں رکھ دی تھی۔ اظہر جاوید عمر بھر محبتیں تقسیم کرتے رہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی رحلت کو ان کے چاہنے والوں نے دل سے محسوس کیا ہے۔ تازہ شمارے میں اظہر جاوید کے حوالے سے شامل متعدد تحریریں قابلِ توجہ ہیں۔ خاص طور پر سوالنامے کے جوابات کے تحت ڈاکٹر انور سدید نے اظہر جاوید مرحوم کے بارے میں بہت سی باتوں سے قارئینِ تخلیق کو نئی آگاہی بخشی ہے، جس سے ہمیں مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

.....

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

﴿2﴾ برادرِ عزیز!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ مل گیا تھا جس کی اطلاع بذریعہ SMS کر دی گئی تھی۔ محض کہنے کی بات نہیں، پرچہ واقعتاً خوب ہے اور ''باپ پر پوت'' والے محاورے کا بھرپور اظہار لیے ہوئے ہے۔ رب کریم آپ کے وسائل اور توانائیوں میں اضافہ فرمائے اور آپ نے جس عزم کے ساتھ ''تخلیق'' کے دورِ نو کا آغاز کیا ہے اُس کی تکمیل ہو۔ (آمین)!

.....

افتخار مجاز (لاہور)

﴿3﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

آپ کو تعزیت کا خط نہ ارسال کر سکا۔ ایک تو اس اچانک صدمے نے بوکھلا دیا تھا دوسرے کافی عرصے سے (یکم جنوری سے) میری صحت کے مسائل ختم نہیں ہو رہے۔ اظہر جاوید کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ وہ کیسے انسان تھے اور

''تخلیق'' پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہ کیسے ایڈیٹر تھے۔ بہت خوبیوں والے آدمی تھے، کم از کم میرے علم کے مطابق ایسے صاف ستھرے اور صاف دل لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

مجھے اور ڈاکٹر انور سدید کو یہی فکر تھی کہ اب ''تخلیق'' کا کیا ہوگا؟ آپ کی ادارت میں پہلا شمارہ دیکھا تو بہت اطمینان اور خوشی ہوئی۔ اللہ کرے آپ ہر لحاظ سے اور ہر شعبے میں اظہر جاوید کے جانشین ثابت ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم سے پیار کرنے والے سبھی اہل قلم کا تعاون آپ کو حاصل رہے گا جیسا کہ پہلے پرچے سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نے ''پہلی بات'' میں جن تجربات کا اظہار کیا ہے ابھی ایسے کئی مراحل سے آپ کو گذرنا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ کندن بنیں گے۔

اظہر صاحب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ ہر جگہ موجود پائے جاتے تھے۔ جب کچھ فراغت ہو تو آپ بھی ان کا یہ انداز اپنائیں۔ ایک مدیر کے لئے یہ ضروری اور بہت مفید ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ اظہر صاحب سے اشتہاروں کے حصول اور جو لوگ ''تخلیق'' کو پسند کرتے ہیں اور اس میں لکھتے ہیں ان کے حوالے سے یہ کہتا رہا ہوں کہ جو آپ کی دوستی کا دم بھرتا ہے اس کو پرچے کا خریدار بھی بننا چاہیئے۔ اس وقت تو زرِ سالانہ صرف -/200 روپے تھا۔ میں غالباً ان چند لوگوں میں سے ہوں جو باقاعدہ خریدار تھے۔ آپ اپنے شعبۂ سرکولیشن سے معلوم کر کے مطلع کیجئے تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ نیا دور شروع ہو چکا ہے لیکن میرا چندہ کب ختم ہو رہا ہے۔ میں پھر خریداروں میں شامل ہو جاؤں گا۔

آپ اظہر صاحب کی تمام خوبیاں اپنائیں مگر فقیرانہ اور درویشانہ رویّہ نہ اپنائیں۔ نہ ہی ان کی طرح منکسر المزاجی کے ''عالمی مقابلے'' میں شامل ہونے کی کوشش کریں۔ میری گہری اور مخلصانہ دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ صحت نے اجازت دی تو کچھ لکھنے کی بھی کوشش کروں گا۔ آپ نے ہر اعتبار سے بہت اچھا پرچہ نکالا ہے۔ خوش رہیں۔

علی سفیان آفاقی (لاہور)

.....

﴿4﴾ عزیزِ گرامی سونان صاحب!

سلام مسنون! یہ خط تو مجھے ستمبر 2012ء میں اس وقت لکھنا چاہیے تھا جب آپ کی ادارت میں ترتیب دیا ہوا ''تخلیق'' کا دوسرا شمارہ ملا تھا۔ ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کر کے آپ نے حیران کر دیا تھا۔ ستمبر کا پرچہ جب سے ملا ہے مَیں آپ کی ادارتی صلاحیت کو داد دے رہا ہوں جو آپ کو اظہر جاوید سے وراثت میں ملی ہے۔ یوں محسوس ہوا کہ یہ پرچہ سونان نے نہیں، اظہر جاوید نے مرتّب کیا ہے۔ اس حیرانی کی وجہ سے آپ کو جلدی خط نہ لکھ سکا۔ معذرت!

میں نے اس شمارے میں سب سے پہلے ''گوشۂ اظہر جاوید'' کے مضامین پڑھے۔ شہزاد احمد کی اظہر جاوید سے پہلی ملاقات کا حال پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں کہ اب اس مضمون کا مصنف بھی دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ تاہم انہوں نے اس بات کی

گواہی رقم کر دی کہ انہوں نے اظہر جاوید کی نوجوانی میں ہی ان کے وجود میں مہذّب، متمدّن اور وضعدار انسان کے نقوش دیکھ لیے تھے۔ سب سے اچھا مضمون تو ابدال بیلا نے لکھا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اظہر جاوید کے ظاہر اور باطن میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا مضمون تجزیاتی نوعیت کا ہے۔ اس میں اظہر جاوید کی داخلی نفسیات منکشف کی گئی ہے۔ فضا میں اُڑتی ہوئی کئی غلط فہمیوں کو رفع کر دیا گیا ہے۔ قیصر نجفی صاحب نے ''تخلیق۔ اظہر جاوید نمبر'' پر ایک بھرپور نظر ڈالی ہے اور اسے لکھنے والوں کے صادق احساسات کا شمارہ قرار دیا ہے۔ علی سفیان آفاقی، شاہد بخاری اور انوار فیروز کے مطبوعہ تبصروں میں بھی نکتہ بنیادی نظر آتا ہے۔ سرفراز سیّد نے سوالنامے کے جوابات اظہر جاوید سے ملاقاتوں کی روشنی میں لکھے گئے ہیں اور ان کی ادیب نوازی کا خوبصورت نقش سامنے آتا ہے۔

افسانے میں نے اسی ترتیب سے پڑھے جس ترتیب سے آپ نے چھاپے ہیں۔ بلاشبہ نجم الحسن رضوی، عطیہ سیّد، بشریٰ اعجاز، سرور سکھیرا اور یٰسین احمد سے ان کے نمائندہ افسانے حاصل کرنا معمولی بات نہیں، اور اب میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس مرتبہ افسانے کا حصہ سب مضامین پر حاوی ہے۔ نجم الحسن رضوی نے داخلی سندھ کی ایک غیر انسانی روایت سے مؤثر افسانہ تخلیق کیا ہے۔ افسانے کے اختتام پر جب ''چھوٹے شاہ جی'' کا اسرار کھلتا ہے تو فطرت کا تقاضا عجب انداز میں اپنی حقیقت کھولتا ہے۔ عطیہ سیّد صاحبہ کا افسانہ ''چھلاوہ'' انسانی زندگی کی ایک دوسری حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ سکینہ کے وجود کے غائب ہونے کے بعد جب نعیم بستر پر موجود نظر آتا ہے تو افسانے کا تاثر تبدیل ہو جاتا ہے۔ محترمہ عطیہ سیّد نے جس روانی، آسانی اور کامرانی سے یہ افسانہ بیان کیا ہے وہ لائقِ صد تحسین ہے۔

اردو ادب کو بشریٰ اعجاز اور طاہرہ اقبال کی صورت میں دو عمدہ دیہات نگار خواتین میسّر آ گئی ہیں۔ بشریٰ اعجاز کا افسانہ ''پڑاؤ'' ان کے رنگِ خاص سے قدرے ہٹا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا مرکزی کردار ''قاری فیض'' دیہاتی اقدار کا نمائندہ ہے اور ''رخسانہ تنویر'' روایتی زلیخا ہے جس کی جنسی جبلّت وار کرنے سے نہیں چُوکتی۔ یہ افسانہ کئی حسّاس مقامات سے گزر کر جب اختتام کو پہنچتا ہے تو زندگی کا ڈرامہ ایک نئے انداز میں سامنے آتا ہے اور بھگوان پورے کی ایک پتلی گلی افسانے کو انوکھا موڑ دے دیتی ہے۔ کیا یہ ''بھگوان سٹریٹ'' کا پروٹو ٹائپ ہے؟ قاری بشریٰ اعجاز کی فنکاری پر عش عش کر اُٹھتا ہے۔ آپ نے ''تخلیق'' کے اداریے میں ''الفاظ کو دولت'' قرار دیا ہے۔ انہیں کفایت سے استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ''اختصار سے لکھیے'' تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ میں اس تحریک کا حامی ہوں اور اس خط کو مزید طول دینے کی بجائے ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

انور سدید (لاہور)

.....

﴿5﴾ مکرمی سونان صاحب!

بہت روز ہوئے آپ کا خط ملا تھا لیکن میں بوجوہ وقت پر جواب نہ دے سکا جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ نے اپنے والد صاحب (اظہر جاوید) کی یادگار جاری رکھ کر ایک نیک روایت کی پاسداری کی ہے، جس کا اجر آپ کو ضرور ملے گا۔ آپ نے پہلے دو پرچے نکال کر اور عمدہ طریقے سے ایڈٹ کر کے کمال کر دیا ہے اور ادب کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اُمید ہے آپ اِسی طرح اپنی ہمت و استقامت سے کام لیتے ہوئے اِس پرچے کو مزید نکھارتے جائیں گے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو آپ بلا جھجک مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

شاہد علی خاں (لاہور)

.....

﴿6﴾ محترمی!

کئی روز سے ''تخلیق'' آیا رکھا ہے۔ پڑھ بھی چکا ہوں۔ مگر خط نہیں لکھ سکا۔ درحقیقت سارا بوجھ تو تم پر آ پڑا ہے مگر ہم ہیں کہ ابھی تک سنبھل نہیں پائے۔ تم نے بڑی ہمّت سے کام لیا ہے اور اس قلیل عرصہ میں دو پرچے بھی شائع کر ڈالے ہیں۔ دفتر بھی شفٹ کیا ہے۔ اظہر کے دوستوں کو حوصلہ بھی دیا ہے۔ کام رُکنے نہیں دیا۔ بظاہر تو لوگ نا اُمید ہو چکے تھے مگر تمہارے حوصلے نے تمام رکاوٹوں کو ہٹا کر رستہ بنا لیا ہے۔ تم واقعی داد کے مستحق ہو۔ جو لوگ اظہر کے ساتھ تھے اور اب آپ کے ساتھ بھی تعاون کر رہے ہیں، اللہ پاک انہیں جزائے خیر دے۔

آفتاب راجا (خوشاب)

.....

﴿7﴾ محترمی!

آپ کی عنایت سے ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ ستمبر 2012ء میرے ہاتھوں میں ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ گذشتہ ''اظہر جاوید نمبر'' کے بعد بھی آپ نے ان کے گوشے کے لیے 28 صفحات مختص کیے۔ یہ کارِ خیر جاری رہنا چاہیے۔ ایک دنیا ان سے متاثر تھی لہٰذا ان کے متعلق لکھنے والے بھی بے شمار۔ اس طرح ہمارا عمل اس روایت کے خلاف ہوگا کہ پسِ مردن سب خواب و خیال۔

اس شمارے کی سب سے خاص تحریر ڈاکٹر ابدال بیلا کا ''پیا دیکھن کی آس'' ہے۔ ابدال بیلا نے جس طرح اظہر جاوید کو یاد کیا ہے اس نے ہمیں ایک مرتبہ پھر غمگین کر دیا۔ ابدال اس قبیلے کے لکھاری ہیں جس کی ایک کھیپ میں قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی تھے۔ سچائیاں آشکار کرنے والے یہ ادیب، اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔

یہ صرف ''تخلیق'' نہیں تمام ادبی رسالوں کا مسئلہ ہے کہ انہیں اپنے اخراجات پورے کرنے میں مشکل پیش آتی

ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کتب اور رسالے خریدنے کا ہمارے ہاں چلن نہیں۔لوگ چار سو روپے کا چرغہ لبِ سڑک چبا لیتے ہیں لیکن چالیس روپے کی کتاب یا رسالہ خریدا نہیں جاتا۔مہذّب دنیا میں کتابوں کی تجارت ایک منافع بخش تجارت ہے جبکہ ہمارے ہاں صورتِ حال مختلف ہے۔اس ضمن میں شعور اور آگہی پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ اسے اپنی ذمہ داری جانیں اور کتب اور رسائل کی سرپرستی کریں۔ویسے تو ہم اُردو کا غم کھانے سے نہیں تھکتے تاہم جو کام کرنے کا ہے وہ نہیں کرتے۔ہمارے ادباء ہی اس طرف نہیں آتے، بلکہ کتب و رسائل۔

غلام شبیر رانا جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔''اسلوب کی تفہیم'' میں جس طرح مثالوں سے اسلوبیات کی وضاحت کی ہے یہ ان ہی کو زیبا ہے۔ڈاکٹر انور سدید صاحب کا مضمون ''ناول کا فن اور نقاد'' مختلف حوالوں سے ایک معلوماتی اور دقیع تحریر ہے۔اُردو کے ناول نگاروں کے لیے خصوصاً نئے لکھنے والوں کے لیے یہ کام کی چیز ہے۔راشد محمود چدھڑ نے ''قرۃ العین کی افسانہ نگاری'' کا خوب تجزیہ کیا ہے۔عینی نے جیسی فعال اور متحرک زندگی گزاری وہ ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔بے باکی اور بے ساختگی ان کے افسانوں کا جزو لاینفک ہے۔مصنف نے ان کے خوبصورت حوالوں سے اپنی تحریر کو سجایا ہے۔

شمارے میں شامل پانچوں افسانے خوب ہیں لیکن بشریٰ اعجاز کا ''پڑاؤ'' مجھے پسند آیا۔اگرچہ طویل ہے جبکہ میں اختصار کو افسانے کا حُسن سمجھتا ہوں لیکن اس افسانے نے میرے گرد تاثرات کی ایک دنیا قائم کر دی جو افسانے کا ماحصل ہے۔یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔

نجیب عمر (کراچی)

.....

﴿8﴾ سونان اظہر جاوید صاحب!

ہند کو میں ''ہر کدے آ وَ جی آیاں نوں''۔''تخلیق'' کو پا کر کیا بتاؤں کس قدر خوشی ہوئی۔دریں حال دل پکار اٹھا، اے اظہر جاوید! تجھے کہاں سے لائیں۔آپ نے جدائی کے غم کو آب و رنگ دے کر ''تخلیق'' کے صفحات پر روشن روشن کر دیا ہے۔ ''اظہر جاوید نمبر'' میں ''خود کو'' غیر حاضر پا کر قلق ہوا۔خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے ''تخلیق'' کو اوجھل نہیں ہونے دیا۔جب بڑے بڑے ''تاجور'' جریدے اوجھل ہو گئے ہیں۔آپ نے ادبی ''آب و نمک'' کا امتزاج بھی عمدہ کر رکھا ہے۔یقیناً اظہر جاوید مرحوم کی روح خوش ہو گی۔میں نے نئے پتے پر منی آرڈر بھیجا تھا، اس کی رسید نہیں ملی۔دعا یہی ہے کہ ''تخلیق'' کی شمع روشن رہے احباب مقدور بھر دستِ تعاون بڑھائیں۔

آصف ثاقب (ہزارہ)

.....

﴿9﴾ پیارے بیٹے سونان اظہر!

دو روز پیشتر ''تخلیق'' نئی سج دھج کے ساتھ موصول ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے اظہر جاوید بہ نفسِ نفیس میرے گھر پہنچ گئے ہیں اور وہ آج بھی اس دنیا میں ہیں۔ جس طرح آپ نے ''تخلیق'' کو نئی زندگی عطا کی ہے، یقیناً یہ ایک بے لوث محنت کرنے والا بیٹا ہی کر سکتا ہے۔ ''تخلیق'' بذاتِ خود ایک ادبی تاریخ ہے۔ آپ کے کاندھے پر اظہر جاوید کی شاندار کارکردگی کا جو تمغہ زندگی نے سجایا، اس کا حق یقیناً آپ نے ادا کر دیا۔ میں آپ کو آفرین کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یوں لگا جیسے اظہر جاوید ہر قاری سے اور اپنے ہر مصنّف اور شاعر سے براہِ راست مخاطب ہیں۔''

.....

بسمل صابری (ساہیوال)

﴿10﴾ عزیزِ محترم سونان صاحب!

مجھے 'تخلیق' کا ''اظہر جاوید نمبر'' ملا۔ اس پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالی ہے۔ اظہر جاوید اور میرا ایک المیہ مشترک تھا۔ ہم دونوں مضافات کے آدمی تھے اور اپنے مستقبل کو ڈھونڈتے ہوئے شہرِ ناپرساں میں آ پہنچے تھے۔ اظہر جاوید دل گردے اور ہمّت والا آدمی تھا۔ حالات کے تھپیڑوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔ اظہر جاوید شائد 66ء میں لاہور آیا اور اس سے میری پہلی ملاقات 67ء میں 'ادبِ لطیف' کے دفتر میں ہوئی۔ پھر اک دوبار ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں مقبول جہانگیر کے آفس میں ہم ملے۔ یونانی نقش و نگار اور غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی زلفیں اظہر جاوید کی پہچان تھی۔ کھل کے قہقہہ لگانے والا، ہر ایک سے گرم جوشی سے ملنے والا اور غضب کا جملے باز اظہر جاوید جب بھی ملا، نئی حیرتوں میں ڈال گیا۔ اس زمانے میں بھی وہ چیدہ چیدہ قلمکار خواتین میں مقبول تھا۔ انتہا کا خوددار شخص تھا۔ بعض اوقات اس کی جیب میں ٹانگے کا کرایہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ منزل پہ پہنچنے کیلئے کئی میل پیدل چلتا لیکن کسی یار دوست کی سواری پر لفٹ لینا اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ کسی ادبی محفل سے اٹھ کر خاموشی سے غائب ہو جاتا۔ کیونکہ اسے دور کسی دوسری جگہ جانا ہوتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ محفل برخاست ہونے پر کوئی اسے لفٹ دینے پر اصرار نہیں کرے گا۔ وہ بھید سے بھرا ہوا ایک چھلاوا تھا۔ کسی کے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی کو یہ اجازت دیتا کہ وہ اس کے ذاتی حالات سے آگاہ ہو۔ مولا مست آدمی، تنگدستی، عسرت اور مالی پریشانی کے باوجود اس کا دل بادشاہوں جیسا تھا۔ اظہر سے چہرہ بہ چہرہ آخری ملاقات ملتان میں عذرا اصغر کی کتاب کی تعارفی تقریب میں ہوئی۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ ''تخلیق'' کی اسے فکر تھی۔ بعد ازاں ٹیلیفون پر رابطہ رہا جو آخر تک قائم رہا۔''

.....

غلام نبی اعوان (راولپنڈی)

﴿11﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

''اظہر جاوید نمبر'' ملا تو فون پر رسید دے دی مگر اب جو ''تخلیق'' ملا اپنے خوبصورت ''گیٹ اپ'' کے ساتھ تو..... بہت سی دعائیں تمہارے لئے لبوں تک آ گئیں اور خط لکھ کر داد دینے کو جی چاہا..... خدا تمہیں استقامت دے، اظہر جاوید صاحب کا یہ مشن جاری رہے کہ..... ''تخلیق'' ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور اب بھی..... وہ تخلیق کے ہر صفحے پر موجود ہیں اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ..... رب کریم ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)!

تسنیم کوثر (لاہور)

.....

﴿12﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

خدا آپ کو اور ''تخلیق'' کو نظرِ بد سے بچائے اور ترقی دے۔ آمین! ''تخلیق'' کا ستمبر کا شمارہ موصول ہو گیا ہے۔ آپ نے ''تخلیق'' کی روایات کو بخوبی قائم رکھا ہے۔ مجھے پرچے میں نئے مدیران کی دلچسپی اور رکھ رکھاؤ قدرے زیادہ اور گہرا نظر آیا ہے۔ اظہر جاوید کے اس عظیم ادبی بار آور اور خوشبودار پودے کی آپ نے جس انداز میں آبیاری کی ہے، وہ سعادت مند اولاد اور سپوت بیٹے کی مظہر ہے۔

پرچے کے مندرجات بہت مضبوط ہیں۔ حصہ شاعری بہت متاثر کن ہے۔ ایک ایک غزل قابلِ داد ہے اور قابل تعریف۔ محترمہ بسمل صابری کی غزل پختہ کلامی اور شاعری کا دل محسوس ہوتی ہے۔ بسمل صاحبہ قطعی طور پر ایک مہان شاعرہ ہیں۔

عظیم راہی (کراچی)

.....

﴿13﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

میں بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ''تخلیق'' کے ''اظہر جاوید نمبر'' سے نوازا۔ ساری ادبی دنیا میں اظہر جاوید صاحب کے انتقال سے ''تخلیق'' کے بارے میں اس کی اشاعت سے مایوسی کی جو لہر اٹھی تھی اسے آپ نے نہ صرف دور کر دیا بلکہ اپنے والد مرحوم کے اس عظیم ورثے کی حفاظت کی ہے اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا جو فیصلہ کیا ہے' خدا یقیناً آپ کو کامیابیاں عطا کرے گا، اس لئے کہ اظہر جاوید صاحب کے چاہنے والوں کا حلقہ بے حد وسیع ہے، ہزاروں لوگوں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اظہر جاوید نمبر نکال کر آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ ایک بڑے شاعر ادیب کے بیٹے میں جو ادبی جراثیم ہوتے ہیں وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح اجاگر ہو کے رہتے ہیں اور وہ ساری خصوصیات ''اظہر جاوید نمبر'' میں موجود ہیں۔ اُمید ہے اپنے والد مرحوم کی طرح آپ کی محبتیں بھی مجھے حاصل رہیں گی۔

سیفی سرونجی (انڈیا)

.....

﴿14﴾ سونان میاں! دعائیں!

''اظہر جاوید نمبر'' کی اشاعت سے تم نے صرف قارئین 'تخلیق' اور محبان اظہر جاوید ہی کو خوش نہیں کیا بلکہ اپنے بابا کی روح کو بھی سکون پہنچایا ہے۔ اظہر نے اپنی شخصیت کو ''تخلیق'' کے پیچھے چھپالیا تھا جسے اب اس نمبر نے سب پر واضح کر دیا ہے۔ ان کی موت کے بعد انکی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

.....

سید علی جمال نقوی (کراچی)

﴿15﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

آپ کے والد گرامی کی وفات کے وقت میں ملک سے باہر تھا۔ سٹاف کالج ٹریننگ کے حوالے سے میں روم، اٹلی، وینس، مراکش، رباط وغیرہ میں رہا اور اسی دوران پتہ چلا کہ اظہر جاوید انتقال کر گئے۔ وہ میرے سینئر تھے اس لیے بہت سی ادبی تحریکوں اور کانفرنسوں میں ان کے ساتھ شریک ہونے کا موقعہ ملا۔ ان کا ''نمبر'' دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اللہ کرے یہ چراغ جلتا رہے، ساحر لدھیانوی پر ان کی تصنیف بہت عمدہ ہے، ساحؔر کو میں بھی اپنا روحانی استاد تصور کرتا ہوں۔ ان کی شخصیت کے حوالے سے بہت سے دوستوں نے لکھا، بہت سے واقعات کا میں بھی عینی شاہد ہوں، اللہ کرے ان کا لگایا ہوا پودا ''تخلیق'' ایک تحریک بنے اور ادب کی آبیاری ہوتی رہے۔''

.....

کرامت بخاریؔ (لاہور)

﴿16﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

''اظہر جاوید نمبر'' نظر نواز ہوا۔ یتیمی کا داغ دل میں سمائے تمہاری یہ اوّلین کاوش قابلِ ستائش ہے شفیق باپ کی دائمی جدائی سے تم سوگوار ہو۔ بھری دنیا میں تنہا تنہا ہو۔ تمہاری روح کی آبیاری کرنے والا باپ آسودۂ خاک ہو گیا۔ ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں دینے والا محبت بھرا درخت جڑ سے اکھڑ گیا۔

سونان بیٹے تم اپنے رب کریم کے اس ارشاد کی عملی تفسیر بن جاؤ۔ ''اِنَّ اللہ مع الّصابرین!'' موت برحق ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ تمہارے مجاہد باپ نے کس فاتحانہ انداز سے موت کو گلے لگایا۔ نہ کوئی محتاجی، نہ معذوری.....

سراپا محبت و خلوص، جوہر شناس، پیکر اخلاق، وفادار اور مہمان نواز۔ قابل تحسین جدوجہد کے مالک۔

اظہر جاوید..... میں دل کی گہرائیوں سے تمہاری عظمت کو سلام پیش کرتی ہوں اور دعا گو ہوں کہ ع

''آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے''

سعدیہ سونان کے اصرار پر میں نے اپنے دلی تاثرات صفحۂ قرطاس پر اتار دیئے ہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو انور سدید

صاحب کو دکھالیں، میں ادیبہ ہوں نہ شاعر۔لیکن اچھے ادبا اور شعراء کی پرستار اور دل سے قدر دان ہوں۔ان کی تحریروں سے طمانیت قلب نصیب ہوتی ہے۔''

جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

.....

﴿17﴾ محترمی سونان صاحب!

مرحوم اظہر جاوید کی وفات کے غم میں مجھے برابر کا شریک سمجھیں۔پچھلے سال جب اُنہیں دل کی تکلیف ہوئی تو میں سعودیہ میں تھا (وہاں میرا بیٹا ڈاکٹر ہے) مجھے میری عزیزہ ڈاکٹر طاہرہ بخاری نے اطلاع دی۔میں نے ٹیلی فون پر مزاج پرسی کی۔واپسی پر دفتر میں حاضر ہو کر محبت کا اظہار کیا۔

مرحوم لکھنے والوں پر بہت مشفق تھے۔مجھے تازہ شمارہ دیا۔میں نے عرض کیا ''ذرا رجسٹر دیکھ لیں میرا چندہ کب تک ہے۔میں سال بھر کا چندہ دے دوں۔'' فرمایا ''آپ تشریف لائے بس یہی کافی ہے۔چندے کا کیا لینا دینا'' لیکن میں نے سال کا چندہ میز پر رکھتے ہوئے اجازت چاہی۔میں خود شوگر اور انجائنا کا مریض ہوں۔80 سال عمر ہے۔چودہ سال شوگر کو ہو گئے۔ بہر حال اتنا شاندار نمبر نکالنا آپ کی پہلی کامیابی ہے۔ایک سال کا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔

زوار حسین (ٹوبہ ٹیک سنگھ)

.....

﴿18﴾ عزیز محترم سونان اظہر!

''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' آپ کی محنت اور محبت کا عکاس ہے۔باپ کے ورثہ کی حفاظت اور باپ کے کام کو آگے بڑھانا اچھی اولاد کا ایک پسندیدہ عمل ہے اور آپ نے اس عمل کو پوری دلجمعی سے سرانجام دیا ہے۔آپ کو مبارک ہو۔ اللہ تعالےٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے۔اظہر جاوید صاحب نے مشرق و مغرب میں محبت کرنے والوں کا ایک گرانقدر حلقہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔شاد آباد رہیئے۔

اعزاز احمد آذر (لاہور)

.....

﴿19﴾ جناب سونان!

سلام عرض ہے۔انٹرنیٹ کی ایک خبر سے علم ہوا کہ آپ نے اپنے والد محترم جناب اظہر جاوید مرحوم کی روایت کو آگے بڑھانے کی ٹھانی ہے۔چنانچہ آپ نے اپنی ادارت میں 'تخلیق' کا ایک شمارہ ان کی یاد میں شائع کیا ہے۔میرے نام 'تخلیق' کا آخری شمارہ بابت فروری ۲۰۱۲ اسی مہینے کے آخر میں پہنچا تھا۔(میں تخلیق کا باضابطہ خریدار تھا)۔اس شمارے میں میرا

ایک مضمون بعنوان ''اختر جمال۔ کچھ یادیں کچھ باتیں'' شامل ہے۔ممکن ہوتو اپنی ادارت میں شائع ہونے والے شمارے کی ایک کاپی میرے نام روانہ کیجئے۔عنایت ہوگی۔''

شاہین (کینیڈا)

.....

﴿20﴾ جناب سونان صاحب!

''امید ہے آپ بخریت ہونگے۔ یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ ''تخلیق'' اپنا سفر دوبارہ شروع کررہا ہے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ رہیں گی تاکہ کامیابی آپ کے قدم چومے۔ میں ''تخلیق'' کا پرانا قاری ہوں اس لئے سالانہ چندہ ختم ہوتے ہی، رسالہ بغیر پوچھے، ایک سال کے لئے V.P کردیا کریں۔''

ڈاکٹر مشتاق احمد (نوشہرہ)

.....

﴿21﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

یہ بات قارئین ادب کیلئے باعث راحت ہے کہ آپ اپنے عظیم والدگرامی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ''تخلیق'' کو زندہ و جاوید رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔اللہ کریم آپ کو استقامت عطا فرمائے۔ہم جیسے ''تخلیق'' سے محبت رکھنے والے عام قارئین کو اس سے زیادہ اور کیا خوشی ہوسکتی ہے کہ جناب اظہر جاوید کو یاد کرنے کیلئے ان کی یادگار ''تخلیق'' ہمارے ہاتھوں میں ہوا کرے گی۔اللہ کریم آپ کی ہمت اور شوق قائم رکھے۔

اظہر جاوید ایک عظیم دانشور اور عظیم تر ادیب تھے۔ادبی دنیا انہیں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔وہ اقلیمِ ادب کی روح تھے اور ادبی گھرانہ ان کے دم سے آباد تھا۔اب ویرانی کا راج ہے.....آج صبح کی اخبار نے مزید رنجیدہ کردیا۔شہزاد احمد رحلت فرما گئے۔بس رہے نام اللہ کا۔کل من علیہا فان! آپ سے گزارش ہے کہ ''اظہر جاوید نمبر'' بذریعہ وی پی مجھے ارسال فرما دیں اور ''تخلیق'' کا Subscription میں ساتھ ہی ادا کردوں گا۔''

پروفیسر جلیل الرحمٰن (لاہور)

.....

﴿22﴾ مکرمی سونان صاحب!

کچھ دنوں کے لئے کراچی سے باہر تھا واپسی پر آپ کا خط ملا۔ جناب اظہر جاوید صاحب کے انتقال کی خبر تو اخبارات سے مل گئی تھی۔ بہت افسوس ہوا تھا۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے، اور آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے۔آمین! اظہر صاحب سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔مئی 2011 میں میں نے ''تخلیق'' کی ممبرشپ کے لئے زرسالانہ بھیجا تھا۔ایک دو بار ان سے ٹیلیفون پر بات ہوئی تھی۔ جب بھی شام ۴ بجے ٹیلیفون کیا تو انہوں نے خود اٹھایا۔معلوم ہوتا تھا جیسے دفتر اور گھر

ایک ہی ہے۔ان کی ''تخلیق'' کے ساتھ وابستگی فراموش نہیں کی جاسکتی،اب آپ نے ''تخلیق'' کا بیڑہ اٹھایا ہے۔دعا ہے خدا آپ کو کامیاب کرے۔گذشتہ سال کا بھیجا ہوا زرِسالانہ تو اب ختم ہو چکا۔اطلاع دیجئے گا کہ اب آپ نے زرِسالانہ کیا مقرر کیا ہے۔

سید ارشاد وارث (کراچی) .....

﴿23﴾ برادرم سونان اظہر جاوید!

میں آپ کے والدِ محترم کی موت پر انتہائی غمگین ہوں میری تعزیت قبول کرلیں۔''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' مل گیا ہے۔میرے اوپر اظہر جاوید مرحوم کا یہ قرض ہے کہ انہوں نے مجھے اس وقت ادب دنیا سے روشناس کرایا جب میں فرسٹ ائیر کا ادنیٰ سا طالب علم تھا گورنمنٹ کالج ٹانک کا۔انہوں نے ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں میری پہلی نظم ''استفسار'' چھاپی تھی۔یہ میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔انہوں نے مجھے اس کا باقاعدہ معاوضہ ستائیس روپے چیک کے ذریعے بھیجا تھا۔یہ 1968ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔اس نظم کی اشاعت کے بعد مجھ میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔دوسری تخلیق میری آج کی غزل کے عنوان (پہلی غزل) سے روزنامہ ''انجام'' میں چھپی۔اس طرح مجھے اظہر جاوید نے متعارف کروایا۔

واقعی اظہر جاوید مرحوم کرشماتی خوبیوں کی حامل شخصیت تھے۔انہوں نے تخلیق کو تادم زیست جاری و ساری رکھا اور خاموشی سے ادب کی خدمت میں مگن رہے۔ان کا نام ایک شاعر، ادیب، مدیر کی حیثیت سے ہمیشہ جلی حروف سے لکھا جائیگا۔یہ قابل رشک بات ہے کہ ''تخلیق'' ہر پرچے میں ان کے لیے ایک گوشہ مختص کرے گا۔امید ہے کہ آپ اپنے والدِ محترم کے مشن کو مشعل کی طرح لیکر چلیں گے انشاءاللہ۔

راشد کندی (کراچی) .....

﴿24﴾ جناب سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' ملا۔بہت بہت شکریہ۔کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اچانک عالم بقا کی جانب اتنی جلدی روانہ ہو جائیں گے لیکن 'تخلیق' سے محبت کرنے والوں کو مشیت الٰہی کے تحت یہ صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

اس شمارے میں تمام قلمی معاونین نے ان کی ذات وصفات کے حوالے سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ لاہور کی تہذیبی فضا کے اہم فرد تھے۔کتنی خوب صورت بات ہے اور قابلِ تعریف بھی کہ انہوں نے اپنے پرچے میں دوسروں کو آگے بڑھایا اور اپنے آپ کو قطعاً نمایاں کرنے کی کوشش نہ کی حالاں کہ اپنی شاعری، بلغاروی کہانیوں کے

تراجم، سوانح نگاری (بحوالہ ساحرلدھیانوی) اور اداریوں میں ادبی مسائل کی نشاندہی کے حوالے سے وہ پرچے کو بجا طور سے اپنی تحریروں سے مزّین کر سکتے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بے غرض آدمی تھے اور انہوں نے ادبی دوستوں کی دلداری کی، پرچے کو وقت پر لانے اور اردو دنیا تک پہنچانے کے لئے اپنی صحت کو داؤ پر لگا دیا۔ 'تخلیق' میں قلمی معاونین، ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور عام قارئین کے خطوط کا شعبہ جسے لوگ 'ہائیڈ پارک' کے نام سے یاد کرتے تھے بذات خود ''نقد ونظر'' کا ضامن تھا اور اس میں ہر بار وہ ہی چاشنی بھری ہوتی تھی جو شاعری، تنقیدی مضامین اور فکشن سے موسوم ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ''تخلیق'' اسے محبت کرنے والوں کی ایک لمبی قطار ہے جو اس شمع کو بجھنے نہ دے گی۔ آپ کے لئے دعا ہے کہ آپ کو خدا توفیق دے کہ آپ اپنی کمٹ منٹ پر پورے اتریں۔

ممتاز احمد خان (کراچی)

.....

﴿25﴾ سونان اظہر!

جب یہ خبر ملی کہ اظہر جاوید نہیں رہے تو مانو وقت کا بَل کھاتا سمندر ٹھہر گیا اور وقت گہرے سنّاٹوں میں ڈھل گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے دھارے 10 برس پیچھے کی طرف بہنے لگے۔ نہ جانے کتنے بھنور، کتنے موڑ، کتنے موسم، کتنی رُتیں وقت کے اِن دھاروں میں دھڑکنے لگیں، برسوں باقاعدہ جو ایک رسالہ گھر کی دہلیز پر دستک دیتا رہا' جس کے ہاتھوں ادب کا جہان کھلتا رہا' جو میرے اندر کی ادیبہ، اُردو کی طالبہ کے لئے اک ادارہ تھا' وہ دروازہ بند ہو گیا؟ ہمیشہ کے لئے؟ وہ محل جس میں اُردو ادب کی تمام صِنفیں رقص کرتی رہیں، کُھل کر سانس لیتی رہیں، وہ رقص تھم گیا؟ ہمیشہ کے لئے؟

پھر سونان اظہر کا فون آیا۔ اس نے کہا کچھ لکھ کر بھیجوں، ''اظہر جاوید نمبر'' کے لئے۔ ادھر اظہر جاوید کی خبر سے طبیعت ناساز چل رہی تھی..... پھر قلم بھی ساتھ نہیں دے رہا تھا لیکن خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔ ''اظہر جاوید نمبر'' کے لئے کچھ لکھ نہ سکی۔ لیکن دعا گو ہوں کہ اِس محلِ ''تخلیق'' کی' جس میں برسوں اُردو ادب کی ہر صنف رقص میں ڈوبی رہی..... ان کا رقص اظہر جاوید کے جانے کے بعد بھی نہ تھمے۔ ''تخلیق'' کا یہ بلند دروازہ ہمیشہ لکھنے والوں کے لئے کھلا رہے اور اس دہلیز پر ہمیشہ عقیدت کے چراغ جلتے رہیں۔

روپا صبا (چنڈی گڑھ)

.....

﴿26﴾ مکرمی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کے مکتوب کے سرنامہ پر کوئی دوسرا متخاطب لکھنا ابھی نامانوس ہے۔ ''اظہر جاوید نمبر'' پر تبصرہ لکھنا مجھ پہ واجب تھا میں تو عام ادبی جرائد کو اوّل تا آخر مطالعہ کرنے کے بعد مکمل تبصراتی خط لکھنے کا اعزاز رکھتی ہوں۔ یہ نمبر ایک جامع،

بھرپور اور شاندار خراج تحسین تھا۔ ہماری ایک ''کولیگ'' کی خوبصورت الوداعی تقریب (ریٹائرمنٹ) کو دیکھ کر ہماری ایک ساتھی نے کہا تھا ایسی عالی شان تقریب میرے اعزاز میں ہو تو آج ریٹائر ہو جاؤں۔ اظہر جاوید نمبر نا قابل فراموش یادنامہ ہے۔

ترنجن' کے عنوان سے خواتین کے تاثرات کو شامل کیا گیا غالباً ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ ادیبوں میں حضرات اور خواتین کو الگ الگ کیا گیا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اظہر جاوید کو یاد کرنے والوں میں خواتین لکھاریوں کی کثرت ہے۔ محترمہ بانو قدسیہ نے اپنے تاثرات میں اس امر کی تائید کی ہے۔ ''تخلیق'' کو ایک یہ خصوصی امتیاز بھی حاصل رہا کہ اس میں لکھنے والیوں کو جس طرح پذیرائی ملی اس طرح تو بڑی بڑی ''این جی اوز اور حقوق نسواں کا کوئی ادارہ بھی خواتین کو عزت احترام نہ دے سکا''۔

اب سونان اظہر جاوید کا ''تخلیق'' کو زندہ رکھنے کا عہد صبح اُمید ہے۔ سلسلۂ حیات یونہی جاری رہنا عین قانون فطرت ہے ''تخلیق'' کے سفر کی اس جداگانہ جہت پر اس کی کامرانی اور ترقی کی دعا کرتی ہوں۔

دردانہ نوشین خان (مظفر گڑھ)

.....

﴿27﴾ جناب سونان صاحب!

آپ کی قیادت میں ''تخلیق'' کی اشاعت دیکھ کر دلی کیفیت کو بیان کرنا خامۂ محبت کے بس کی بات نہیں ہے۔ نیرنگ ساقی صاحب نے میرا منی آرڈر واپس کر دیا تھا یہ کہتے ہوئے کہ ''تخلیق'' کا آئندہ شائع ہونا مشکل ہے۔ آپ کو اور طفیل بھائی (مدیر ''مسکراہٹ'') کو بھی کئی خطوط ارسال کیے یہ جاننے کے لئے کہ ''تخلیق'' اب شائع ہوگا یا نہیں مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ خیر! اچانک بغیر کسی اطلاع کے ''تخلیق'' اپنی سابقہ روایت کے ساتھ وارد ہوا۔ یقین ہی نہیں ہوا کہ اسے سونان اظہر نے سنوارا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اظہر جاوید آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ بہ ہر حال کسی نے سچ کہا ہے کہ ''سمندر کی مچھلی کو تیرنا سکھایا نہیں جاتا'' آپ کی صحافتی ہُنر مندی اور ادارتی تہذیب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ :

باپ کا علم نہ بیٹے کہ اگر ازبر ہو　　پھر پسر مالک میراثِ پدر کیوں کر ہو

آپ نے سابقہ روایات کو برقرار رکھا ہے۔ نئے پرانے قلم کاروں سے رابطہ بحال کرنے کی سعی خیر کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے والد محترم کے اس جملے کو دُہرایا ہے کہ ''دم ہے تو ''تخلیق'' نکلتا رہے گا''۔ آمین ثم آمین!

ڈاکٹر وصی عمرانی واجدی (نیپال)

.....

﴿28﴾ سونان اظہر صاحب!

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ ملا۔ اس کاوش کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، کیوں

کہ مدیروں کے انتقال کے بعد رسائل عموماً بند ہو جاتے ہیں مگر یہ آپ کو اپنے والد سے جو والہانہ عقیدت و محبت تھی اس کا اظہار ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا خدا آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ آمین!

اس شمارے میں گوشۂ اظہر جاوید میں شہزاد احمد صاحب کا مضمون بہت اچھا لگا۔ انور سدید صاحب کے بارے میں کیا کہوں کہ وہ تو علم کا سمندر ہیں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے مگر بشریٰ اعجاز کا ''پڑاؤ'' بہت پسند آیا۔ غزلیں، نظمیں سب ہی پسند آئے۔

مہ جبین قیصر (کراچی)

.....

﴿29﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

اظہر جی کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' موصول ہوا۔ پرچہ کی جملہ تخلیقات / مشمولات (مضامین، تاثرات، منظوم نذرانے اور خطوط) کا مطالعہ کیا لیکن ایسے میں مجھے اظہر جی کی سادگی اور اکیلے پن کا بہت افسوس ہوا۔ انہی مذکورہ ''خصائص'' کا کرب باطنی طور پر ہمیشہ اُن کی ذات سے منسلک رہا اور وہ اس کرب سے حاصل ہونے والے درد و غم کو بڑے صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے..... بظاہر تو ہمارے درمیان اظہر جاوید موجود نہیں لیکن اُن کی روح، اُن کا فن، اُن کی باتیں، اُن کی یادیں، اُن کا ''تخلیق'' اور اس کی ''تخلیقات'' تو موجود ہیں، جو ''حیاتِ جاودانی'' کے مصداق ہیں۔

جنید امجد (جھنگ)

.....

﴿30﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' مل گیا ہے۔ آپ کا از حد شکر گزار ہوں۔ رسالہ اپنی شان میں بہت اعلیٰ ہے۔ اظہر جاوید مرحوم کے متعلق ''تخلیق'' کا یہ نمبر ایک گرانقدر دستاویز کی مانند ہے۔ یہاں پر جن لوگوں نے دیکھا ہے، سب نے بہت تعریف کی ہے۔ سب کا خیال ہے کہ اظہر جاوید کے فرزندِ ارجمند نے اپنے باپ کا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تخلیق'' جاری رکھنے کی ہمّت عطا فرمائیں۔

خالد حسین عبداللہ (راولپنڈی)

.....

﴿31﴾ عزیز سونان اظہر جاوید!

دعائے عمر دراز۔ محترم اظہر جاوید صاحب کے انتقال کی خبر ہندی اخبار میں پڑھی تو یقین نہیں ہوا۔ فوراً دہلی نارنگ ساقی صاحب کو فون کیا تو انہوں نے بھرے دل سے اس خبر کی تصدیق کی تو یقین کرنا پڑا۔ اب تو یہی دعا ہے کہ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ اور ہمیں یہ صدمہ برداشت کرنے کی ہمت و توفیق دے۔

آج جناب ڈاکٹر کیول دھیر صاحب کی طرف سے ارسال کردہ ''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' ملا تو بے انتہا خوشی ہوئی کہ آپ سب نے مل کر اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، تو گھبرائیں نہیں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اظہر صاحب نے ناسازگار حالات میں بھی ''تخلیق'' کو جاری رکھا تھا اب تو حالات بہت بدل چکے ہیں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔

کرشن پرویز (انڈیا)

.....

﴿32﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' پڑھتے ہوئے بار بار گوشہ ہائے چشم نم ہوتے رہے۔ بہت سے نامور ادبا نے عقیدت، محبت اور خلوص سے اظہر جاوید کو یاد کیا ہے۔ کتنی یادیں ایک شخص کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ محبت اور ادب کا ایک وسیع سلسلہ آباد ہے۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے رفقائے اظہر جاوید کے ساتھ مل کر سلسلہ ''تخلیق'' کو جاری رکھنے کا عزم کیا ہے۔

محترم اظہر جاوید سے میری کئی یادگار ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی بار جناب سرور سکھیرا کی اقامت گاہ پر میں ان سے ملا۔ اس عشائیے میں جناب حمید اختر، امجد اسلام امجد، مستنصر حسین تارڑ، صدیقہ بیگم (مدیرہ ادبِ لطیف)، نیلم احمد بشیر، پروین عاطف اور آمنہ مفتی سمیت کئی اہم لکھاری شریک تھے۔ میں اس سے پہلے ''تخلیق'' کا بے قاعدہ قاری تھا۔ انہوں نے مجھے دفتر ''تخلیق'' کا پتہ سمجھایا اور آنے کی دعوت دی۔ چند دنوں بعد ہی میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ دفتر کی فضا اپنائیت سے لبریز تھی۔ چائے پینے کے دوران میں گفتگو کئی ادبی معاملات سے ہوتی ہوئی ان کے بھارت کے دوروں کی طرف نکل گئی۔

پھر ایک دن میں ان کے روبرو، دفتر تخلیق، میں بیٹھا تھا۔ فلموں کی باتیں چل پڑیں۔ کہنے لگے اب تو عرصہ ہوا سینما گھر میں جا کر کوئی فلم نہیں دیکھی۔ میں نے جھٹ سے عرض کیا کہ اب تو بھارتی فلمیں بھی پاکستانی سینما گھروں میں نمائش کے لیے پیش کی جا رہی ہیں اور فورٹریس سٹیڈیم کے نزدیک ایک معیاری سینما گھر ہے جہاں مسلح افواج کے افسران کے لیے پچاس فیصد رعایت پر ٹکٹ ملتے ہیں۔ میں نے سادہ لوحی سے انہیں پیشکش کی کہ جب وہ چاہیں، ہم فلم دیکھنے چلیں گے۔ فوراً بولے:

''اب میں آپ کے ساتھ تھوڑی فلم دیکھنے جاؤں گا۔ کسی دن کسی خاتون دوست کے ساتھ چلا جاؤں گا۔''

مجھے ان کی وفات کی خبر سرور سکھیرا صاحب نے دی۔ میں کچھ دیر تک سُن بیٹھا رہا۔ پھر سوچا

ہرگز نمیرد آن کہ دش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اور ان کا دوام تو ''تخلیق'' کے ورق ورق پر ثبت ہے۔ ''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' ایک حوالہ جاتی شمارہ ہے۔ اردو ادب

کے حالیہ منظر نامے کے قریباً ہر بڑے ادیب نے ان پر لکھا ہے۔ مجھے آپ کی محنت، محبت اور لیاقت سے قوی امید ہے کہ تخلیق اسی رفتار سے جاری رہے گا۔

شہزاد نیّر (کوٹلی۔آزاد کشمیر) .....

﴿33﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

اللہ تعالیٰ آپ کے والدِ گرامی جناب اظہر جاوید کو جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے۔ ''تخلیق'' کے ساتھ مرحوم کا رشتہ بھی وہی تھا جو آپ کے ساتھ ہے۔ میں آپ کو ''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' شائع کرنے پر دل مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ نے اپنے والدِ گرامی اور تخلیق کی لاج رکھی ہے۔ آپ نے ''اظہر جاوید نمبر'' میں اپنا حق ادا کیا ہے۔ اسی طرح مختلف اہلِ علم و دانش نے جس عقیدت اور محبت سے اس ادبی ہیرو کو اپنی تحریروں کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ خدا کرے کہ یہ سفر اسی طرح جاری رہے اور ''تخلیق'' کا یہ سفر مزید کامیابیوں اور کامرانیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

سکندر حیات میکن (سرگودھا) .....

﴿34﴾ محترم سونان اظہر

آپ کا خط ملا۔ ''تخلیق'' کے حوالے سے اور اس خط کو ہم نے آنسوؤں سے تعبیر کیا جس میں خوشی اور غم دونوں عنصر ہیں، بے شک جاوید مرحوم ایک اعلیٰ انسان تھے ان سے ملاقات ان کی تحریر ''اپنی بات'' سے ہوئی تھی جس سے ان کی شخصیت و سوچ ہم تک پہنچی تھی۔ میں اس رسالے سے اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہتی ہوں لہٰذا مجھے رسالہ ضرور بھجوایئے گا۔

مسرت رعنا (لاہور) .....

﴿35﴾ محترم سونان!

آپ کا فون آیا تو گویا آپ نے مجھے (state of inertia) سے باہر نکالا۔ سال سے کچھ اوپر ہونے کو آیا ہے کہ میں ہر قسم کی ادبی سرگرمی سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ آپ کے فون نے مجھے تحرک بخشا اور میں قلم لے کر اظہر جاوید کو یاد کرنے بیٹھ گیا۔ اظہر جاوید سے میرا تعلق کم از کم چار عشروں تک محیط ہے۔ ایک بات جو قابلِ ذکر ہے کہ اظہر جاوید ''تخلیق'' کا مدیر ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بہت کم چھاپا کرتے تھے۔ میری اظہر سے صرف ایک ملاقات ہو سکی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ محترمہ بے نظیر کے پہلے دورِ حکومت میں اپنی ملازمت پر دوبارہ بحال کئے گئے۔ اس کے بعد میں بیرونِ ملک چلا گیا پھر پاکستان آیا تو لاہور جا کر ان کو ڈھونڈ کر دفتر ''تخلیق'' مل کر آیا۔ گرم جوشی سے ملتے ہوئے میرا نام سُن کر کہنے لگے ''آپ کا خط ''افکار'' میں چھپا ہے۔'' میں

نے اثبات میں سر ہلایا اور میں ان کی یادداشت پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات پر زیادہ حیران ہُوا کہ وہ دوسرے ادبی رسائل میں چھپنے والی چیزوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔اس ملاقات کے بعد ''تخلیق'' سے رشتہ ایسا استوار ہوا کہ آخر تک قائم رہا۔ افسوس اس کے بعد خرابیِ صحت کی وجہ سے دوبارہ لاہور نہ آ سکا اور اظہر جاوید سے دوبارہ روبرو ملاقات نہ کر سکا۔کاش.....؟

محمود رحیم (اسلام آباد)

.....

﴿36﴾ عزیزم سونان اظہر!

''اظہر جاوید نمبر'' مجھے بہت دیر سے اور بہت ہی انتظار کے بعد ملا۔ساتھ ہی ستمبر کا پرچہ بھی تھا۔معلوم ہُوا کہ تمھیں میرا ایڈریس نہیں مل رہا تھا۔تحسین و آفرین تمہیں سونان بیٹے .....اظہر جاوید نمبر نکالنے پر..... یادگار تصاویر سے رسالے کو اور بھی خوبصورت بنا دیا۔سارے ہی مضامین، پاکستانی مصنفین، غیر ملکی مصنفین کے لکھے ہوئے قابلِ ستائش ہیں۔اظہر جاوید اپنی تحریروں کے آئینے میں، انجمنِ خیال.....منظوم نذرانے سب کچھ اُداس کر دینے والا تھا۔اُداسی بھی عجیب قسم کی تھی کہ پڑھتے پڑھتے رُک جانا اور رُک رُک کے پڑھتے جانا۔

اظہر جاوید سے فون پہ گفتگو رہتی تھی۔ایک بار میں نے کہا، بھائی آپ کہاں غائب ہیں گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں..... آپ فون نہیں اُٹھاتے۔ہنس کے بولے ''بی بی تم مجھے نانا کہہ لو، دادا کہہ لو، بڈھا بابا کہہ لو، تایا کہہ لو، چاچا کہہ لو، بھائی کبھی نہ کہنا'' مجھے بہت ہنسی آئی۔اس کے بعد میں نے جب بھی فون کیا اظہر جی کہہ کر بُلایا۔آج وہ ہم سے دُور ہیں، آسودۂ خاک ہیں مگر یادوں کی قندیل میں جگمگتے ہیں۔

تسنیم فاطمہ (راولپنڈی)

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

پہلے جس کی تعریفوں میں نظمیں، غزلیں لکھتا تھا
اب اُس کو بے مہر لکھوں میں، یہ کوئی انصاف نہیں